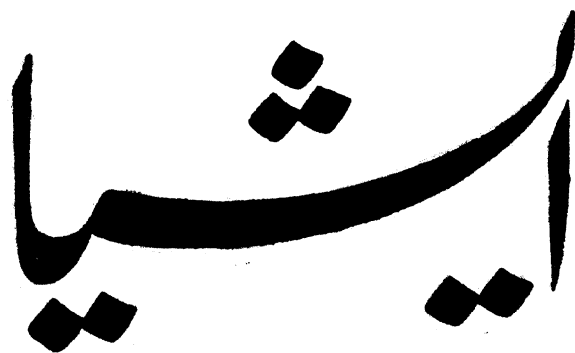


UNIVERSAL
LIBRARY

OU_224180

UNIVERSAL
LIBRARY



پنجارن

ریکارڈ نمبر ۱۶۵۰

حضرت ساعر نظامی کی مقبول ترین شاہکار نظم جو انہوں نے خود اپنی درد بھری
مست اور جاذب آواز میں ریکارڈ کی ہے

ہمیں سرت ہے کہ شائقین کرام کی خدمت میں ہیں ایک بالکل انوکھی چیز پیش کرنیکا فخر حاصل ہے۔ ریکارڈ کیا ہے
موسیقی و شعریت کا ایک اچھا موقع ہے جس میں ایک شاعر کے دلچسپ جذبات کو اس کی اپنی ہی جاذب آواز نے ادا
کے ہے اور شاعر بھی کون؟ جناب ساعر نظامی۔ جو کہ اپنے تخیل کی بلندی الفاظ کی شیرینی اور آواز کی مترنم جاذبیت کے سبب
ہندوستان کے شعراء میں ایک ممتاز ترین حیثیت رکھتے ہیں۔

جناب ساعر نے اس ریکارڈ پر اپنی دلکش ترین نظم ”پنجارن“ کو پیش کیا ہے۔ جوں جوں وہ اپنی جذبات میں وہی مترنم آواز
سے اس مجید نظم کو ادا کرتے جاتے ہیں سامعین کے دل پر ایک حسین تصویر نقش ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک وجہ کی ہی کیفیت
ہوتی جاتی ہے اور دل ہی چاہتا ہے کہ اس لطیف چیز کو سننے ہی جائیں۔ واقعی یہ نادر ریکارڈ بار بار سننے کے قابل ہے۔

”ہر ماسٹرس وائس“

(۱۹۳۵ء میں جاری ہوا)

ادبی مرکز میٹر کا علمی و ادبی ماہنامہ

ایشیا

مَنْظُورِ شَدَّ

محکمہ تعلیمات حکومت صوبہ متحدہ

حکومت بہار حکومت سی پی اور حکومت صوبہ پنجاب

مترتبہ

ساغراظمی

ناشر

مکتبہ ساغرا ادبی مرکز میٹر

جملہ حقوق محفوظ

قیمت سالانہ اکھڑ روپیہ دوسرے ملکوں سے
ایجنسیوں ۲۵ فی صدی کمیشن

(مذکورہ مفت نہیں بھیجا جاتا)

ہفت سالانہ مبلغ پانچ روپیہ (پندرہ سالہ)
قیمت فی نمبر آٹے

فہرست مضامین ایسیاجون جولائی ۱۹۴۲ء

نمبر صفحہ	مضمون نگار	مضمون	شمارہ	نمبر صفحہ	مضمون نگار	مضمون	شمارہ
۶۹	مولانا حسرت موہانی	نغمہ آہستہ خرام	۱۶	۲		فہرست	۱
۷۰	سازغ نظامی	خاکستر	۱۷	۳	ادارہ	سخن ہائے گفتنی اور دوسرے نثر	۲
۷۱	اختر الایمان	شکست	۱۸			نئی صبح	
۷۲	اختر ہوشیار پوری	عزم	۱۹			(ادبیات و سیاسیات)	
۷۳	ظفر تاباں دہلوی	غزل	۲۰			آئے دلی دنیا کی ایک جھلک (نئے ایک جھلک)	۳
۷۴	نواب محمد علی بیگ لکھنؤی - ل	غزل	۲۱	۶	اکرام حسین بی - ۷	جدید بنگالی شاعری	۴
۷۵	شور (علیگ)	طیاریہ	۲۲	۱۷	اکرام قمر ایم - ۱	روما کے سیاسی افکار	۵
۷۶	خمار بارہ بنگوی	غزل	۲۳	۲۴	سید مظفر برنی	اُردو شاعری کے میلانات	۶
۷۷	سلیمان ادیب	بنتِ عم سے!	۲۴	۲۵	سراج الدین آذر	فارسی اور ہندوستانی تہذیب	۷
				۲۶	یوسف ظفر	خود فریب	۸
						دکھ مکھ	
						افسانے اور ڈرامے	
۷۸	ادارہ	برہان	۲۵			آیو الفوف (ڈراما)	۹
۷۹	"	ساقی	۲۶			پیشِ لفظ	۱۰
۸۱	"	ادب لطیف	۲۷	۳۶	علی اطہر	شام	۱۱
۸۲	"	ادب	۲۸	۵۰	قاضی عبدالغفار	رکشا والا	۱۲
۸۳	"	انجمن برقی اردو کی کہانی	۲۹	۵۲	صاحبزادہ محمد علی گلشن آبادی	عجیب بات	۱۳
۸۴	"	انشائے داغ	۳۰	۵۳	عبدالرشید عرفان	خود داریاں	۱۴
				۵۹	مکرم وردی		
				۶۴	فتیساب اکبر آبادی		
						نیا راگ	
						نظم و غزل	
				۶۶	انجمن ملیج آبادی	حرفِ آخر کا ایک ورق	۱۵

ایشیا

جلد ۶ جون جولائی ۱۹۳۲ء نمبر ۱۳

سخنہ گفتنی!

ایک طرف جنگ ہے کہ کسی صورت مقابہت یا فیصلہ کی صورت اختیار نہیں کرتی۔ معلوم وہ انسانیت، تہذیب اور تمدن کے علمبردار آج اپنا علم کہاں رکھ کر بھول گئے۔ معلوم انہیں کبھی اپنے پلٹنے دعووں کا خیال بھی آتا ہے یا نہیں۔ آج ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تمام تہذیب اور تمدن ایک حسین بلی کی مانند جس کی نرم و نازک پوستین کے نیچے بہت تیز ناخن چھپے ہوئے ہیں جنہیں وہ اہستہ آہستہ نکالتی جا رہی ہے اس چند سالہ جنگ اور اس کی خاص کر ہولناکیاں دیکھ کر مستقبل تاریک سے تاریک تر نظر آنے لگتا ہے۔ ان توپوں، بموں، ہوائی جہازوں اور ٹینکوں کی خوشخوار آوازیں سے ایک بھی امید کی شعاع بھونکتی نظر نہیں آتی۔ انسانی زندگی ایک عجیب شکست میں ہے جس کا کوئی تدارک سمجھ میں نہیں آتا۔

اس شمارہ کے مضامین پر اگر فوٹو آڈیا
اس شمارہ کے مضامین تبصہ کیا گیا تو یقیناً بہت طویل جوائگہ اور آج کل ویسے بھی فرصت کم ہی میسر آتی ہے۔ مرزا ارشاد بیگ کا مضمون آنے والی دنیا کی ایک جھلک، گرین کے نظریہ کی اضافی شکل ہے۔ اردو میں ایسے ٹھوس اور سائنسی مضامین کی بڑی کمی ہے اسکے علاوہ اکرام قر، اکرام حسین، سید مظفر حسین برنی اور سراج الدین کے مضامین اپنی اپنی کاوش اور پہنچ کے لحاظ سے اپنے لئے ایک خاص جگہ کے مالک ہیں۔

علی اطہر کے تراجم آپ اس سے پہلے بھی ایشیا میں دیکھ چکے ہیں۔

آج کل کسی پرچہ کا زندہ زندہ رہنا اگر معجزہ نہیں تو کم از کم ایسی ہی کوئی چیز ضرور ہے۔ اس مشکل کو کچھ وہی زیادہ جانتا ہے جو اس سے متعلق ہے۔ اور ہر وقت اس سے دوچار رہتا ہے۔ ان الفاظ سے مدعا یہ نہیں کہ ہم نے آپ کی شکایات کو نظر انداز کرنا چاہا بلکہ یہ کہ ہماری شکل آپ کی شکایت سے زیادہ ہے۔

اس مرتبہ جون اور جولائی کا مشترکہ نمبر آپ کے ہاتھوں میں پہنچ رہا ہے اور یہ بھی محض کاغذ کی دقت کی بنا پر نکالا گیا ہے۔ جب پرچہ آپ کے پاس پہنچے گا تو آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ سائیکل کے لحاظ سے پرچہ میں ایک ہلکی سی تبدیلی ہے۔ اور شاید وجہ ہم سے پوچھنے کے بجائے آپ خود ہی جان لیں اور یہ بھی بہت ممکن ہے کہ اگر گت نمبر ہا سائیکل عام پرچوں کا سا کرنا پڑے۔

کاغذ کے سلسلے میں دقتیں اٹھانی پڑ رہی ہیں ان سب کا تذکرہ آپ سے کرنا شروع کیا جائے تو کہا نہیں جاسکتا آپ مستقل مزاجی سے سُن سکیں گے یا نہیں اور تذکرہ ہم کرنا بھی نہیں چاہتے۔ بہت ممکن ہے آپ کی طبیعت بھی ہم جی جیسی شکل پسند ہو لیکن اب اس سے کیا حاصل مختصراً یہ کہ ہر جگہ کسی طرح آپ تک پہنچا دیا اور آئندہ بھی پہنچائے رہیں گے۔ اس لئے کہ ہمارے پائے استقلال کو ابھی تک کوئی جنبش نہیں ہوئی۔

یوں تو ساری زندگی ہی دکھ اور پریشانیوں سے معمور ہے لیکن سب سے زیادہ تکلیف دہ زندگی ذمہ داری کی زندگی ہے

آپ کو تراجم میں ایک خاص ملکہ ہے اور ترجمہ بہ نسبت ہوتا ہے۔ تاضی عبدالغفار کسی لغات کے محتاج نہیں۔ ”پیش لفظ“ نہ افسانہ لکھا جاسکتا ہے۔ مضمون۔ میری رائے میں پیش لفظ زندگی کی ایک تعریف ہے یا بذات خود زندگی کا ایک جزو۔ ”عجیب بات“ کا لڑدوسی کے ایک اچھے افسانہ کا ترجمہ ہے۔ لا شفت ظفر ہماری بزم میں پہلی دفعہ شامل ہوئے ہیں ایک اچھی چیز کے ساتھ۔

نیا راگ
جوش کے بارے میں اظہار خیال کرنا اپنے پڑھنے والوں کو جاہل سمجھنے کے مترادف ہے۔ آخر ہوشیار پوری ایک عرصہ کے بعد ایشیا میں درشن دے رہے ہیں۔ ”شکست“ کا شاعر بھی اس مجلس میں پہلی ہی مرتبہ آکر رہا ہے اور اسکے علاوہ اچھی نظمیں اور غزلیں بھی ہیں جو اپنے مضامین، اسلوب بیان، الفاظ کے درست اور خیالات کے لحاظ سے اچھوتی ہیں۔ (ادارہ)

بریلی بدایوں اور ایٹھ کے دوستوں سے

انسانی ارادہ کتنا بے بنیاد اور غیر یقینی فعل ہے، تین ماہ سے خیال تھا کہ پھر فقیر کا پھیرا آپ کی نگری تک ہوگا، مگر بجائے یو۔ بی کے دورے کے دورے کے، دکن کی جست کا میاب ہوئی۔ آپ تک پہنچنا، یا دوسروں تک پہنچنا، یہ جست، یا وہ جست، غرض باوجود بے پروا بالی کے یہ تمام تر اڑان محض زبان و ادب کے اُس مقصد کے لئے جو بظاہر بنیادی اور ضروری معلوم نہیں ہوتا، لیکن انسانی معاشرہ میں اسکی حیثیت قطعی بنیاد ہی ہے۔ میرا آپ تک پہنچنا اور پہنچ کر آپ کو متوجہ کرنا یعنی ”ہم بچا رہیں اور کیلئے“ کا حادثہ جو نا اتفاق کے مقبت ہونے کی دلیل ضرور ہے، مگر میں غالب کا مذاق نہیں رکھتا۔ یعنی ۵

اب ناز عاشقی کو ہے اُس دکن کا انتظار
تم آؤ میرے در پہ تمنا لئے ہوئے — ۹

غیرت تو کچھ اور چاہتی ہے، یعنی مقصد لے کر انسان، انسان سے ملنا چھوڑ دے، فرد خود اجتماعی فرائض کو محسوس کرے، میں تو چاہتا تھا کہ آپ اس وقت تک خود ہی ایشیا کی تجدید خریداری فرما دینگے، مگر میعاد خریداری ختم ہونے کے بعد اس نے نہ تک ۶ نمبر آپ کی خدمت میں پہنچ چکے ہیں اور آپ کے استغنائے کروٹ نہیں لی — ۹

مجھے بہت کچھ حق ہے، لیکن باوجود کلی استحقاق اور ضرورت کے ایشیا کی خریداری کو ”مجبوری کا سودا“ بنانا چاہتا۔ ہاں اس قدر ضرور ضرر کروں گا کہ ۶ پرچے پہنچنے کے بعد اب ہر دوست کو ذرا سالانہ خود ہی بذریعہ منی آرڈر ارسال فرما دینا چاہئے۔ لیکن جو اصحاب سال بھر کیلئے خرید نہیں رہنا چاہتے۔ انہیں محض ۶ ماہ کی قیمت تین روپے (تسے) جو واجب قیمت ہے بذریعہ منی آرڈر ارسال فرما کر مرکز کو ممنون فرمانا چاہئے۔ دھڑکے ہوئے زمانے اور اس لرزے ہوئے وقت کا تقاضہ ہے کہ تمام احباب نازک صورت حال کو محسوس کریں اور اپنا فرض بحالائیں

ساغر نظامی

حیدر آباد دکن
اسلام آباد
۲۵ جون ۱۹۴۶ء

نہی صبح

آنے والی دُنیا کی اک جھلک

حیاتیاتی اور نفسیاتی تحقیق کا سلسلہ

آنے والی مہینہ کی اک جھلک

نئے تمدن کی خصوصیت

مرزا ارشاد بیگ جبکہ مضامین اکثر ایشیا میں شائع ہوتے رہے ہیں باز زندگی اور اس کے تعلقات پر گہری نظر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو کچھ ہو گیا یا جو کچھ ہو چکا اسکی اہمیت ہی نہ مٹ سکتی اسکی نگاہ اور علمی طور پر اسکی کیا تعبیرات ہوتی ہیں یا جو سکتی ہیں۔ موجودہ دنیا ایک عجیب غریب بحران میں غوطہ زن ہے۔ گو کہ تبدیلی اور انقلاب کی ضرورت محسوس کرتے ہیں مگر اسکی تعبیریں کر سکتے، شاید اس لئے کہ وہ سائنٹفک طور پر حالات کے تجربے سے قاصر ہیں، سیاست دان شعراء اور انقلابی ہیر و طوفان کی علامتیں ظاہر کرتے ہیں، مگر ان علامتوں کی مینیہوں کو نہیں بتاتے، شاید ان کا یہ فرض یہی نہیں ہے۔

ارشاد بیگ نے ان فلسفیانہ مسائل پر سات مقالے لکھے ہیں جن میں مسائل حیات کی حیاتیاتی اور نفسیاتی تحقیق کی گئی ہے۔

- | | | |
|--------------------------------|---------------------------------|--|
| (۱) آنے والے تمدن کی خصوصیات | (۲) غیر طبعی ارتقاء میں قیام | (۳) حیاتیاتی اصول اسلحہ |
| (۴) موجودہ ماحول اور نئی حیثیت | (۵) مغربی فلسفہ اور نئی حیاتیات | (۶) قوت کو نیا مفہوم اور استعداد پرانے نظام نو |

۷) مہینہ ازلہ زمین عالم

اس سے پہلے دنیا کے مفکرین نے نئی دنیا کے متعلق اشارے کئے ہیں ہمارے شعراء نے نئے زمانہ اور نئے نظام کے گیت بھی گائے ہیں، یعنی ہم امیدوار جاہلیت گوارے میں ہلکے ہو کر دینے کی مسلسل کوششیں کی گئی ہیں مگر یہ تمام کوششیں بڑی حد تک بھم اور تیرہ و تار حدود سے آگے نہیں بڑھ سکی ہیں، اصل میں جب تک ان خالق اور توفیق کو نہ بتایا جائیگا جو نئی دنیا بنانے کی ذمہ دار ہو سکتی ہیں، مھن خیا لوں میں ایک نئے زمانے کے راگ گانا، کھوکھلی قسم کی جاہلیت سے موجودہ دباؤ ڈالنے والی دنیا میں نسل انسانی کے رجائی بننے کے امکانات بھی ہیں یا نہیں، وہ مہم اور قصور، جاہلیت، جو زندگی کی کشتی کو کھٹے کھٹے جہت میں پھینک دیتے ہیں، اور اس فرقہ و فساد انسان کی طرح پاسکتی ہے، ان مقالات میں ارشاد بیگ نے کوشش کی ہے کہ اس فرقہ و دس کا پتہ لگا یا جائے، کامیابی اور ناکامی کا سوال نہیں، مگر وہ انسانی کے ذہن اور قوت حیات کے ان تقاضوں کی طرف اشارے کئے گئے ہیں جو جاہلیت، کو خواب کے جال سے حقیقت اور باہم بچائے، وضاحت میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

دنیا کے تمام مفکرین ہمارے ساتھ ہیں کہ انسانی ذہن اور تحت الشعور میں ایک عظیم تبدیلی کی ضرورت ہے، موجودہ نسل نوع انسانی کے ارتقاء کی آخری منزل نہیں ہے۔ نیا ارتقاء اور زندگی کی نئی ہیئت کیا ہوگی؟ یہ تجزیہ کرنا وقت کی اولین ضرورت ہے۔ جب تک موجودہ مفکرین معلوم نہیں کر سکتے کہ ذہنی ارتقاء ماحول پر کس طرح نظر انداز ہوتا ہے، کوئی ذہنی تبدیلیاں موجودہ تباہی کی ذمہ دار ہیں، ذہن میں نئے ماحول کی تعمیر کے لئے کتنی اور کیسی صلاحیتیں پیدا ہو چکی ہیں۔ اور وہ صلاحیتیں نیا کے سانچے کو کس طرح مل کر سکیں گی، وہ قوت جو ماحول پر قابو حاصل کر سکتی ہے، اس کی واقعی صورت کیا ہے؟ اور وہ کس کس قدرت پر مشتمل ہے۔ ان مجھدوں کو جب تک معلوم نہ کر لیا جائے ہماری تمام تر جدوجہد جابل ہے۔

ارشاد بیگ کے ان مقالات میں انہیں مسائل کی چھان بین کرنے کی کوشش کی گئی ہے، موجودہ بحران انسانی ذہن کی خود شعوری سطح کی ترقی کو اجاگر کیا گیا ہے اور امید ہے کہ موجودہ غلط و سلی ذہنیت، انقلاب اور فضول اعتراضات، سنیہاں میں ان خالقوں سے مدد ملے گی جن کی زندگی کے وجود پر ہمارا جنگ اور دنیا کی جدوجہد قائم ہے۔

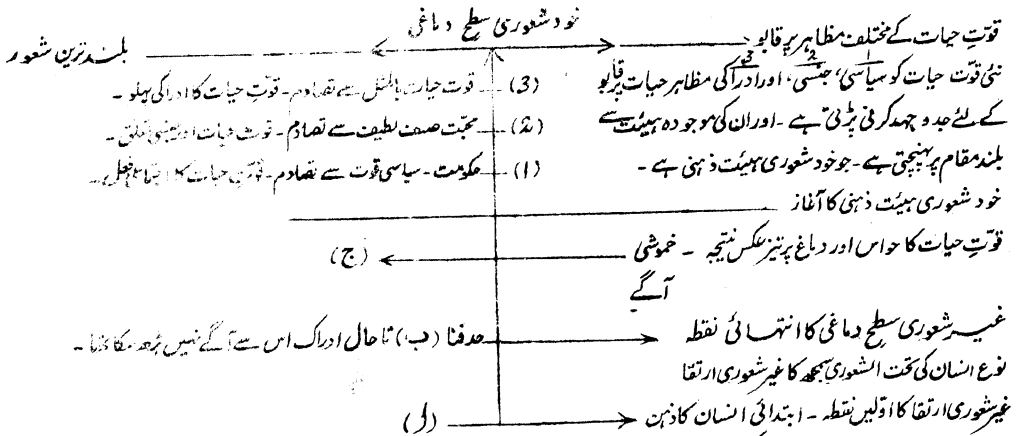
۱۔ کوئی شخص اس مہینہ کی کسی ایک کتاب سے متاثر ہوا تو اسے علم اور دانشور انسان کی کامیابی کا نشان ہے۔

مصطفیٰ کا منہ نہ کھلے تھا تو ہمیں کون سی دنیا دکھائی دے گی؟ اور انہیں کی اساس حیاتیاتی نفس کی بنیاد پر کیا خیال ہو گا؟ **original** این عظیمیہ کے قوت حیات اور ذہن کا قوت کا جدید مفہوم نظر یہ علم، مسئلہ جبر و اختیار، صحیح نظام کے ارتقائی اصول اور اس قسم کے مسائل کا زیرِ ملاحظہ کرنے کی کسی کا گئی ہے۔ مصطفیٰ کے نزدیک یہ وہی حقائق اور حقائق ہیں جن کی بنیاد پر آئندہ دنیا کی تعمیر ہوگی۔

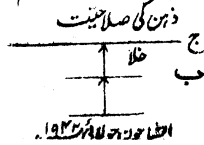
بہر حال اس موضوع کے ماہرین ان کے اس خیال کی تائید یا تردید کر رہے ہیں۔ اگر ان مقالات پر تنقیدی مضامین آئے تو انہیں ان مضامین کو بھی شائع کرنا۔ موجودہ اشاعت میں آسنے والے مضمون کی خصوصیات کے اعتبار سے یہاں مقالہ شائع کرنا چاہتا ہے۔

یہ ایک حیرت انگیز واقعہ ہے کہ تاریخ پر دو سرے عناصر کی بنیاد پر حیاتیاتی عناصر غالب آگئے ہیں۔ اس لئے بننے والی تاریخ حیاتیاتی عمل کی داستان ہوگی۔ نوع انسان کا ادراک اور اس کا ذہن ایک خاص حیاتیاتی دور سے گزر رہا ہے۔ ایک نئی شکل اختیار کر رہا ہے۔ آئندہ انسان خود شعوری ہیئت ذہن کا نتیجہ ہوگا۔ آج سے قبل تاریخ پر کبھی ذہن انسانی نے خود شعوری کے دور میں داخل ہونے کا شرف نہیں حاصل کیا تھا۔ ہمارے حواس ذہن حیات متوجہ یا عینان اور ذہن نے وہ ارتقائی منازل طے نہیں کی تھیں جن کے طے کرنے کے بعد زندگی میں خود شعوری حاصل ہوتی ہے۔

ذہن اور قوت حیات کے حیاتیاتی ارتقائی مابین



ذہن انسانی کی حیاتیاتی ترتیب و تکمیل کے مطالعہ سے یہ واضع ہوتا ہے۔ کہ اسے جنگ کا حال تاریخ کی جدوجہد غیر شعوری جدوجہد ہی ہم قوت حیات کی وہی جتنے تھے لیکن اس کا جائزہ نہیں لے سکتے تھے۔ کیونکہ ہمارے ذہن نے شعوری درجہ حاصل نہیں کیا تھا۔ اس لئے ادراک میں عقلی عنصر کو دخل نہ تھا۔ کیونکہ عقل ہمیشہ علم پہلوؤں کی اپنی گرفت میں لینا چاہتی تھی۔ اور تمام پہلو بھی ادراک کے پردہ پر نہیں آتے تھے۔ حیاتیاتی ارتقا ہمارے ذہن کو آہستہ آہستہ اس عقلی ترتیب سے رہا تھا کہ بالآخر شعوری دیکھ بھل ہو جاتے۔ جب تک شعوری درجہ حاصل نہیں ہوتا عقل کی تمام پرواز ناممکن رہتی ہے اور عقلی عنصر کے دخل سے آزاد نہیں ہو سکتی۔ اس لئے مسائل عالم کا حل اور حقیقت کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ جب تک قوت حیات خود انسان کے ذہن میں ظہور پذیر نہ ہو جائے۔ اس کے متعلق مسائل صرف عقل اور ناممکن حقائق کی بنا پر حل نہیں کیا جاسکتا۔ اور ہم سمجھا جاتا ہے۔ اب تک جسے عقل کا کیا ہے وہ ناممکن اور غیر شعوری قوت حیات ادراک کا پھیلاؤ ہے۔ یہی قوت حیات کی عدم تکمیل سے جو غلط ذہن میں رہ جاتا ہے اسے عقل کے ذریعہ پر کیا جاتا ہے۔



قوت حیات ۲ "ب" تک ذہن میں ارتقائی سطح طے کی ہے۔ اور اسکی وجہ سے "ب" تک نئے حقوق معلوم ہو گئے ہیں۔ "ب" سے "ج" تک کے نئے حقائق بھی اور اسے پوشیدہ ہیں۔ لیکن عقل "ب" تک کے ارتقائی عمل کو مدلل "کی طرح برستی ہے۔ یعنی "ج" تک سوچتی ہے۔ لیکن زندگی کے تمام مناظر کو "ب" کی آنکھ سے ہی دیکھ سکتی ہے۔ "ب" خود نامکمل ہے اور ذہن کی ارتقائی سطح کا ایک تدریجی نقطہ ہے۔ جب تک "ج" کے درجہ تک قوت حیات نہ پہنچے۔ قوت حیات کو ذہن میں شعوری درجہ حاصل ہوگا۔ اور "ب" اور "ج" میں خلا ہوگا۔ اس خلا کو جب تک قوت حیات کا ارتقا پورا نہ کر لے۔ حرف نامکمل عقل کے ذریعہ تکمیل کی مدد سے مسئلہ حیات کو حل نہیں کیا جاسکتا۔ گویا عقل ابھی نامکمل ہے اور تکمیل کے عنصر سے خالی نہیں ہے۔

قوت حیات نے چونکہ ہمارے ذہنی قوی میں تکمیل کے مدارج طے نہیں کئے تھے۔ اس لئے عدم تکمیل کا لازمی نتیجہ نقص۔ حیوانیت۔ تکمیل پرستی۔ بیکار لیل مازی کے سوائے کیا ہو سکتا تھا۔ کیونکہ بغیر خود شعوری ذہن کے حقیقت۔ حق۔ اور صحیح نظام حیات کا فیصلہ کیسے ہو سکتا ہے۔ لیکن آنے والے تمدن میں روح و قوت حیات کی شعوری سطح کے بعد اسکا وجود پوشیدہ باطنی نہیں رہے گا۔ اور یہی قوت حیات کا عملی ثبوت ہوگا۔ حیاتیات کے جدید اصولوں نے (۱) *معمولہ* اور (۲) *معمولہ* کے مسئلہ کو بالکل حل کر لیا ہے۔ آئیوے نے تمدن پر بنی انسانی کو بے سرو پا اور تکمیل مسائل میں الجھنا نہیں پڑے گا۔ اور اس طرح غلط سوالات اور مسائل پر ہماری ذہنی قوتیں ضائع نہیں ہوگی۔ آنے والے نظام کے حل کو قوت حیات پر مکمل قابو ہوگا۔ اور ہر حیرت انگیز حقیقت طبعی سائنس کے بجا اب دلیلی پر قابو پائے سے زیادہ تعجب خیز اور ہماری زندگی کو بالامال کر دینے والی ثابت ہوگی۔

دوسری حقیقت یہ کہ موت کا حجاب اٹھا دیا جائیگا اور انسان دائمی بقا کے دور میں داخل ہو جائیگا۔ موت تو ہوگی۔ لیکن حجاب باقی نہ رہے گا اور انسان موت کو ایک معمولی عمل خیال کرے گا۔

تقدیر۔ اور اسرار۔ اور حجابات کی گتھی واپس جانے لگی۔ حوادث و خطرات زندگی سے تقریباً مفقود ہو جائیں گے۔ حیوانی جبلت اور طریقے ملت جائیں گے۔ آئیوے نے نظام میں ہماری قوت حیات تکمیل کی صورت میں ظهور پذیر ہوگی۔ اس لئے ہماری خواہشات کمال نہیں جائیں گی۔ بلکہ صحیح طور پر تسکین حاصل کریں گی۔ انسان کے تمام جذبات اور آرزوئیں ایسی مطمئن اور بخیر ہوں گی۔ گویا ہر ہزار مضرب کی زد سے صحیح مریخ پر ایک مکمل نغمہ سے ہمراہ جنگ ہوگا۔ اور صحیح معنی میں انسانیت کے دور کا آغاز ہوگا۔

لنگرے کو لے اور اندھوں کی پیدائش بند ہو جائیگی۔ کیونکہ آئیوے نے دور میں حیاتیاتی ارتقا صحیح نظام اختیار کر لیا۔ تمام حیاتیاتی تقاضے دور ہو جائیں گے۔ آئیوے نے نظام ایک حیاتیاتی انقلاب ہے۔ جدید نوع انسان کو حیاتیات کے ایک نئے دور میں داخل ہونا ہے۔ اس وقت تمام دنیا کے سامنے یہی مسئلہ ہے کہ آج نوع انسان شعوری طریقہ حیات حاصل کر لے۔ قومیت نسل۔ مذہب۔ برتری اور ترقی کے تمام غلط تصورات تبدیل ہو جائیں گے۔ کیونکہ دنیا کا تمام نظام اور تمام ذہنیت اور ماحول یکسر بدل جائے گا۔ اس لئے ہر قوم کو اچھا مستقبل اور اپنی پوزیشن آنے والے نقشے میں دیکھنی چاہئے۔ اس وقت تک کا تمام نظام۔ تمام حدود۔ جہد۔ قوم۔ مذہب اور ملک کے تصورات۔ نوآبادیات کا حصول۔ یہ سب قوت حیات کے ارتقائی مدارج کا عبوری نتیجہ تھا۔ وہی قوت حیات اب ہمیں پرامن شانت اور شائستہ اور عالمگیر نظام کے دروازے پر لے آتی ہے۔ جہاں جنگ نہیں ہوگی۔ حیوانی زندگی۔ تکمیل ہوئی آرزوئیں۔ اور جذبات اور بے چین ذہن نہیں ہوگا۔ نامعلوم اور اوجھل قوتوں کا خطرہ۔ موت کی تیرگی اور تاریکی۔ اسرار کا خوف۔ زندگی سے ناامید ہو جائیں گے۔ مغرب میں نوآبادیات کا لالچ اور مشرق میں شعوری تقدیر اور رشت کا فریب قوت حیات کی لازوال اور مدہوش کن بسترات کا بدل ثابت نہیں ہو سکیں گے۔ اور نہ ہی نوآبادیات اور مذہب کے تمام تصورات آنے والے نظام کی قوت کو پسپا کر سکتے ہیں۔ حقیقت قلیل اور افسانہ سے زیادہ شائد اور با عظمت ہوتی ہے۔ حقیقت نے نظام میں مادی خوشیاں اور فوری ذات کا حقیقی کیف اپنے صحیح و فطری ادب میں اضافی شعور ملت اور گمراہ طریقوں اور غلط نظریات پر مبنی نظام کی تمام تباہیوں سے زیادہ مطمئن کرنا لی حقیقت اختیار کر چکی ہے۔

حیاتیاتی ارتقا اور نظام عالم

حیاتیاتی ارتقا کے مختلف مدارج کا جائزہ ہمیں زندگی اور نظام عالم کی آن صورتوں سے واقف کر دیتا ہے جو اس کردار سے اختیار کرنا پڑتی ہیں حیاتیاتی

ارتقاء ہی سطح حاصل کرنے کے لئے اولین عمل انقلاب آج مکمل کیا ہے اور زندگی اب ایک شعوری سطح حاصل کرنے والی ہے۔ بے سرو پا تحقیقات اور بیکار تعمید کا نام قابل کی تاریخ میں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گا۔ اسکے بعد زندگی میں حیاتیاتی نشوونما کی ایسی سطح ابھرے گی کہ طریقہ حکومت نئے زمین سے ختم ہو جائے گا اور ہر شخص اپنے معاش کا خود مالک اور کنٹرول کرنے والا ہوگا۔ تیسرا حیاتیاتی انقلاب زندگی کی بیماریوں سے کلی نجات دلا دیگا۔ اور بالآخر زندگی لافانی ہو جائے گی۔ پیدائش اور موت کا چکر کرہ ارض پر بند ہو جائے گا۔ یہ قوتِ حیات کی حراج اور انتہائی ارتقاء کا قیام ہوگا۔

نظامِ عالم سے متعلق قوتِ حیات کی مختلف ارتقائی صورتیں

(۱) قوتِ حیات کا غیر شعوری ارتقاء۔ شکش حیات۔ قوتِ حیات کی عدم تکمیل ذہن سے متعلق۔ قوتِ حیات اور شعور میں بعد۔ قیاسی تحقیقات و علم۔

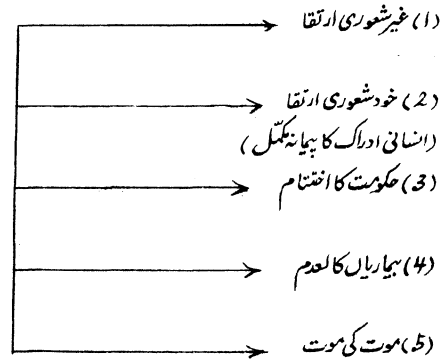
اور نظامات و تخریکیں۔

(۲) خود شعوری ارتقاء۔ قوتِ حیات کا ذہن میں شعوری طور پر انسانی ادراک کے پیمانہ کی تکمیل، قیاسی علم اور تصورات کے زمانہ کا اختتام۔ صحیح نشوونما اور ترقی و انکشافات کا آغاز۔

(۳) حکومت کا اختتام۔ قوتِ حیات ایسے ارتقائی مدارج طے کر چکی ہوگی۔ کہ اس درجہ پر اگر زندگی کے مزید ارتقاء اور اجتماعی تعلقات کو قائم رکھنے کے لئے حکومت کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔

(۴) بیماریاں کا عدم۔ قوتِ حیات کا نشوونما ایسی تشکیل اختیار کر لے گا کہ بیماریاں جاتی رہیں گی۔ بیماریاں قوتِ حیات کے انتشار اور جسم کی اسے سہارنے کی عدم صلاحیت کا نتیجہ ہیں۔

(۵) موت کی موت۔ قوتِ حیات اور ہمارا جسم ایک سطح پر جا بیٹھے اور جسم لافانی ہو جائے گا۔ جسم میں قوتِ مافضت اور صلاحیت اپنے انتہائی مدارج پر ہوگی۔



پہلے درجہ سے دوسرے درجہ تک غیر شعوری ارتقاء کا عمل ہے اور باقی تمام درجات کا عمل شعوری ارتقاء سے متعلق ہے۔ گویا خود شعوری ارتقاء جزو تاریخ کی رفتار شروع ہوگی۔ وہ نوع انسان کے جسم میں قوتِ حیات کا ارتقاء بعد از اختیار کر کے گاؤں کا انتر سماجی نظام۔ سیاسی خا کوں اور زندگی کے دوسرے طریقوں پر بھی پڑے گا۔

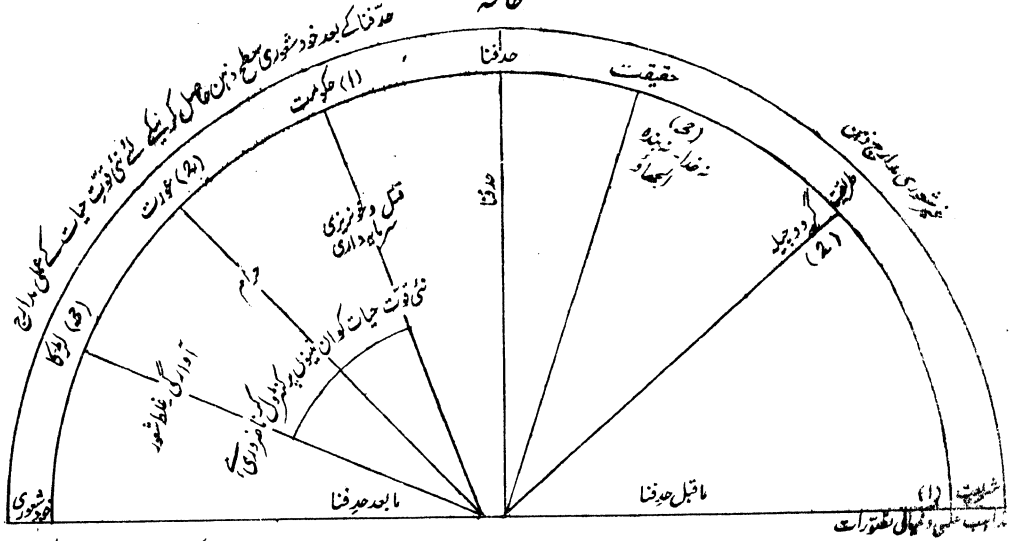
موجودہ شجران۔ اور قوموں اور دنیا کے نظاموں کی حیاتیاتی جائزہ

موجودہ دنیا بے شعوری کی دنیا ہے۔ یعنی قوتِ حیات شعوری حیثیت میں کارفرما نہیں ہے۔ موجودہ نظام کو قوتِ حیات پر قابو نہیں ہے۔ یہ سچ ہے۔

جس کی وجہ سے قتل و غور زہری حص و آرزو تیار چھائے ہوئے ہیں۔ مذہب نے قوت حیات کی شعوری تمیز کے بغیر عقادی خیالات میں نیا کو اُلجھا دیا۔ اس کے علاوہ جو آزاد خیال افراد ہیں وہ بھی کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے۔ کیونکہ قوت حیات کی انہیں تمیز نہیں ہوتی۔ اس لئے مذہبی حل نہیں ہوتا۔ بدیں وجہ موجودہ نظام زندگی کیلئے ایک عذاب بنا ہوا ہے۔ قوت حیات کا ارتقائی عمل جسے خود شعوری کی سطح حاصل کرنی ہے۔ قوت حیات کو کنٹرول کر رہا ہے۔

انسان کی حیاتیاتی قوت حیات کا مختلف مدارج اور اصولوں کی تدبیر بھی سفر

خاکہ



نئی قوت حیات کا سلج ذہن

اطلاق خود شعوری سطح ذہنی کے ساتھ

نتیجہ غیر شعوری اور عدم تکمیل پرستی قوت حیات پر کنٹرول

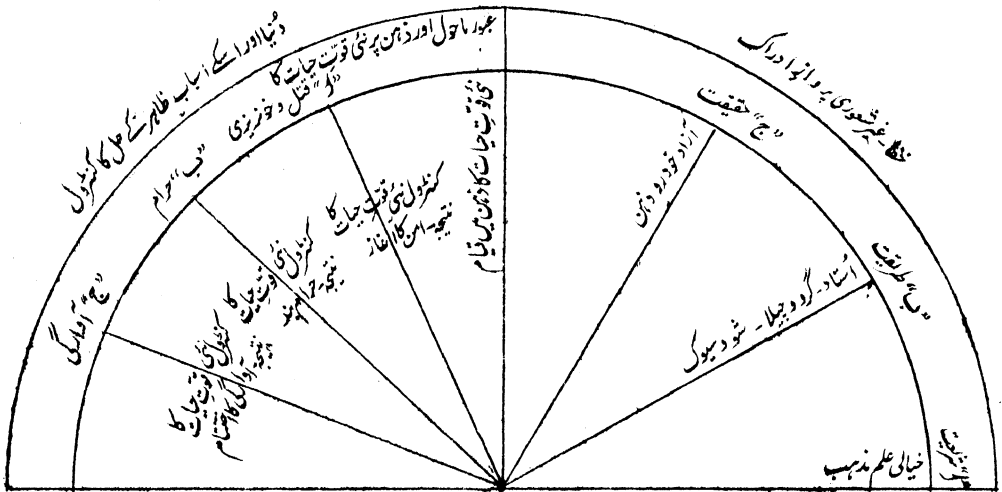
حاکم میں دنیا کے موجودہ مسئلہ کو حیاتیات کی روشنی میں بتایا گیا ہے۔ نقطہ فنا سے قبل انسانی سمجھتین ارتقائی صورتیں اختیار کرتی ہے۔ یا تو وہ کسی ملکی نظامت کے مسلطہ سوا ملکی ہے اور مذہب کی شعوریت سے خود کو وابستہ کر دیتی ہے اور اس طرح زندگی کے مسئلہ کو حل کرنا چاہتی ہے۔ یا اس سے آگے بڑھ کر گرو یا مرشد کے سامنے انسان کا ذہن جھک جاتا ہے۔ اور جن کی تلاش اس کے تعلق کے ذریعہ کرنا چاہتا ہے یا اس سے بھی آگے بڑھنے پر سمجھ خود زندگی کے مسئلہ کا آزادانہ نظر ڈالتی ہے اور خود کو بہت اچھوت دیتی ہے۔ یہاں اگر انسان اپنی ذات کو سب کچھ سمجھتا ہے حتیٰ کہ خود کو خدا تک سمجھنے لگتا ہے۔ لیکن چونکہ قوت حیات کا شعور حاصل نہیں ہوتا اس لئے ذہن خود کو دین جاتا ہے اور کوئی راہ نہیں ملتی۔ غیر شعوری سطح ذہن کی بلندی کا انتہائی نقطہ حد فنا تک ہے۔ اب تک نوع انسان کی جدوجہد اور ارتقا حد فنا سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ ہر انسان کا ذہن اور ادراک نقطہ فنا سے بہت ہے۔ نقطہ فنا پر اگر جو اس قوت حیات کے تیز عکس کی وجہ سے اپنا توازن قائم نہیں رکھ سکتے۔ یہ گویا ادراک کی حد موت ہے۔ نقطہ فنا پر آئے ہی ذہن کو نشوونما کی کافی راہ نہیں ملتی۔ اس سے آگے ارتقا حاصل کرنے کے لئے ادراک کو حد فنا عبور کرنی پڑتی ہے۔ گویا غیر شعوری اور خود شعوری ارتقا کے بیچ میں عدموت حاصل ہے۔ یہاں جو اس قوت حیات کی مدافعت سمجھ رہا ہے دیدیتے ہیں۔ جب اس میں قوت حیات کا بھان تیزی سے ابھرتا ہے تو انسان جو اس کا توازن کھو دیتا ہے۔ لیکن آج انسان کا ذہن زیادہ صلاحیت کا حامل ہے۔ اس لئے وہ توازن کو نہیں

کھوئے گا لیکن اذل جواس پر خاموشی طاری ہوئی لاٹری ہے۔ کیونکہ سمجھ اُبھار حاصل کرتے وقت جاس پر زیادہ دباؤ ڈالتی ہے۔ خاموشی کے بعد خود شعوری اور لغت کے مابین شروع ہوتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر قوتِ حیات کو تکمیل حاصل کرنے کے لئے غیر ترقی یافتہ قوتِ حیات کی عملی صورتوں کو قابو کرنا ضروری ہے۔ ورنہ نئی قوتِ حیات صحیح نظام قائم کرنے سے قاصر رہے گی۔ خود شعوری حاصل کرنے والے ذہن کو عورت کی محبت سے تصادم پذیر ہو کر آگے ارتقائی طور پر بڑھنا ہوگا۔ اور اگر نئی قوتِ حیات عورت کی جنسی تسکین نہ کر سکے۔ تو زندگی کے نظام میں ناقص اور خامیاں رہ جائیں گی۔ اسکے بعد نئی قوتِ حیات بالمثل سے ملکر اپنا پڑتا ہے۔ اور یہ حیاتیاتی فعل نہایت ہی مشکل اور دشوار ہے۔ کیونکہ اس عمل میں دونوں کی جنس ایک ہوئی ہے۔ یہاں جنسی میلان کا سوال پیدا نہیں ہوتا کہ نئی قوتِ حیات جنسی تسکین کے ذریعہ اسے مقنن کر سکے۔ اس لئے قوتِ حیات کو نہایت ہی ضبط کے ساتھ آگے بڑھنا ہوتا ہے۔ اگر نئی قوتِ حیات پسپا ہو جائے تو زندگی کے نظام میں نوع انسان کی سمجھ اور اسکے شعور اور ارادہ پر نئی قوتِ حیات کا کنٹرول نہ ہو سکے گا۔ جب نئی قوتِ حیات اس سے بھی آگے بڑھے جن کا مایاب ہو جائے تو اسے نوع انسان کی اس قوتِ حیات پر پورا قابو حاصل ہو جائے گا جو جابجائی خود شعوری کی منازل سے بچے ہے۔ اور نقطہٴ فنا پر کھڑی ہے۔ آج تمام نوع انسان فقط فنا کچھڑی ہوئی قوتِ حیات کی زد میں ہے۔ وہ اپنے مزید ارتقا اور نشوونما کیلئے جب تک خود شعوری سطح ذہن کا اتباع نہیں کرے گی۔ اس حالت سے نہیں نکل سکے گی۔ نئی قوتِ حیات جب قوتِ حیات بالمثل کو رجوع کر چکتی ہے تو حکومتوں کا نظام بھی متزلزل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ حکومتیں افراد کے اجتماعی شعور کا ہی نتیجہ ہیں۔ اس لئے نئی قوتِ حیات کو سیاسی قوت بھی حاصل ہونی چاہئے گی۔ جب نئی قوتِ حیات کو قوتِ فنا سے گزرنے کے بعد دنیا میں پھیلی ہوئی قوتِ حیات کی ان تین صورتوں پر کنٹرول حاصل ہو جائے گا تو نظامِ عالم سے قتل و خونریزی جالبِ منفعت۔ اور فزکی قربانی مند ہو جائیگی۔ حرام۔ اغلاط۔ عورتوں کی جہتی۔ اور لڑکوں کی آوارگی وغیرہ وہی ختم ہو جائیگی کیونکہ انسان کی قوتِ حیات نئی قوتِ حیات کی گرفت سے گریز نہیں کر سکے گی۔ قوتِ حیات کے غلط انتشار کا نتیجہ یہ ناقص بنتے۔ نئی قوتِ حیات خود ان درجوں سے آگے بڑھ کر مکمل ہو جائیگی۔ اور یہ صحت و نظم کا اعلیٰ ترین نمونہ ہوگی۔ زندگی ایک فرد ہوگی۔ اب تک کے تمام نظام میں زبردست قباحات اور نقص بھرا کسی نظام نے ان حیاتیاتی مدارج کو آج تک طے نہیں کیا۔ جو آئے والا نظام طے کر چکے گا۔

مختلف مذاہب نے عالم ارواح۔ جنت کی زندگی کے تصورات ہمارے سامنے پیش کئے۔ نقطہٴ فنا سے قبل کا ذہن اگر نقطہٴ فنا کے بعد کے مسائل کو گرفت میں لیتا چاہے تو سوائے تخلیقی نگ و پورا ناکامی کے کیا حاصل ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذاہب کا خدا تعالیٰ تصور ہی خدا ہے۔ اور مذہب کو زندگی پر قابو نہیں ہے لیکن نئے نظام میں حیاتیاتی ارتقا کے ذریعہ نقطہٴ فنا سے گزر کر نوع انسان کی قوتِ حیات کو عملی مدارج کے ذریعہ گرفت میں لیا جائیگا۔ اس لئے آئے والے نظام کو زندگی پر قابو حاصل ہوگا۔ یہ نظام محض اہل نہیں ہے۔ بلکہ زندگی کی عملی حقیقت ہے۔ حیاتیاتی نقطہٴ نگاہ سے خدا ایک تصور یا زبان سے ادا کرنے کا لفظ ہی نہیں بلکہ ایک قوت ہے۔ اور اطلاق ایک وصف نہیں۔ بلکہ قوتِ حیات کے نظم و صحت کا لازمی نتیجہ ہے۔ یہ محض آرزوؤں کی قربانی اور حرکت میں بلکہ تسکین اور خواہشات کی تکمیل میں مدد و معاون ہوگا۔ جس ازمین گزشتہ نظاموں نے اُس حیات کا جو قوتِ حیات کو خود شعوری سطح ذہن حاصل کرنے کے بعد طے کی۔ تصورِ ربانی ہمیشہ اور خیالی فرد س کے ذریعہ ایک نعم البدل پیش کیا۔ نقطہٴ فنا سے قبل کے ادراک انسانی پر مبنی نظاموں نے دنیا کی جدوجہد اور نوع انسان کی قوتِ حیات پر کنٹرول نہیں کیا۔ بلکہ خام اور نامکمل پروگرام پیش کئے۔ اسی لئے آج نوع انسان کو تباہی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور اس سے بچنے کیلئے بحال یافتہ قوتِ حیات سے مخالفت کرنا لازمی ہے۔

آئے والا نظام قوتِ حیات کے مزید نشو و ارتقا کے لئے راہ ہنسا کرے گا۔ اور اس کے لئے عملی مدارج کے ذریعہ اور آگے بڑھنے کے مواقع پیدا ہوں گے۔ کیونکہ نیا حیاتیاتی نظام خود عملی مدارج ارتقا کے بعد قائم ہوگا۔ تخلیق با عدم تکمیل پر مبنی قوتِ حیات کی بنیاد پر نہیں۔

خود شعوری سطح ذہن



ادراک کا غیر شعوری ارتقا اور مابج اور دُنیا کے مسائل یہ سب خود شعوری سطح ذہن پر آکر حل ہو جاتے ہیں۔ ایک طرف مسائل زندگی پر بصورت اعتقادی مٹا ہونے نظر ڈالی۔ ادما عقاید اور پراثراتی منازل کے حل کو عقلی اعتقادات کے ذریعہ پورا کرنا چاہا۔ جب زندگی کو خود شعوری حاصل ہو جائے گی تو نئی قوت حیات کی رویت مقصداً خود ہو جائیگی۔ دوسری طرف ادراک نے حیات تیل میں منازل عبور کئے بغیر آزاد ہو ڈرنا شروع کر دیا جس کا نتیجہ تباہی و بربادی ہوا۔ لیکن حیات تیل ہی نظام دُنیا کے مسلک کو عملی اور ارتقائی منازل سے گزرنے کے بعد اس وقت گرفت میں لینا شروع کرتا ہے۔ جب اسے خود شعوری حاصل ہو جاتی ہے۔ خود شعوری کے حصول میں کامیاب ہونے کے بعد ہر ذمی روح پر نئی قوت حیات کی گرفت قائم ہو جائے گی۔ یعنی نئی طاقتوں کا کنٹرول شروع ہو جائے گا۔ یہ کنٹرول آج دنیا کی موجودہ جدوجہد پر شروع ہو گیا ہے۔ اور روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ حیات تات کا اہل قانون ہے۔

قوموں کی نفسیاتی قباحتیں

غائب کہ خدا کی تمیز نہیں ہے۔ مذہب کا خدا تصور اتی خدا ہے۔ حیات تیل قوت حیات کا ذہن سب سے زیادہ حقیقت سے دور ہے۔ اس قوم نے حقیقت کے قصبے گھر لئے۔ ترتیب ارتقا نفس کا غذا راستہ اختیار کیا۔ ہندوؤں نے صحیح راستہ اختیار کرنا تو چاہا۔ لیکن خود شعوری تک نہ پہنچ سکے کی وجہ سے کوئی راہ نہ پاسکے۔ یورپ میں قوم خود رو دلا کنٹرول قتل و خونریزی میں لکھ لکھیں مسلمانوں کا مولوی۔ عیسائیوں کا بادشاہ اور ہندوؤں کا یوگی زندگی کے عملی اور خود شعوری ارتقائی دائرہ میں بیکار ہو کر رہ گئے۔ کیونکہ ان میں قوت حیات نے خود شعوری سطح ذہن کو حاصل کی ہی نہیں تھی۔ اس سے ان کو دور کا بھی فرق نہیں تھا۔ اس لئے تمام مسلمانوں کے مولوی یورپ کے سیاست داں اور ہندوؤں کے مفکر حیات تیل نظام کی گرفت میں لئے جا رہے ہیں۔ ہر قوم کی ترقی کی راہ یہی ہے کہ وہ اپنے ارتقا نفس کی نئی بھرتی ہوئی طاقتوں کا ابتلاء کر لے۔ مسلمانوں کا عقلی علم۔ یورپ کی میکا کی قوت اور ہندوؤں کا عقلی خود شعوری سے منسلک طاقتوں کے سامنے بیکار ہے۔

نفسی اور جسمانی نظام میں تغیر

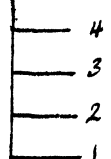
ارتقائی نظام کی طرف یعنی خود شعوری ہیئت ذہنی کی طرف اشارہ کرنے والی حقیقت نفس اور جسمانی نظام میں تغیر ہے۔ نئی قوتیں ہیں آگے کی طرف

دھکیلاتی ہیں اور ہماری ذہنی بلندی موجودہ نظام اور انداز کو زیادہ سمجھ اور مدد بخشنے پر دیکھنا چاہتی ہے۔ جب ادراک میں صحت پیدا ہوتی ہے تو اس کے گہر کی چیزیں مضحکہ انگیز معلوم ہونے لگتی ہیں علاوہ ازیں ہمارے احساسات اور ذہن کو غلط تصورات سے اطمینان بھی نہیں دیتا کیونکہ زندگی کی عملی کیفیتیں ایک لگاتار ہیت پیدا کرتی ہیں۔ انسانی تصورات اور زندگی کے عملی حقائق کے اس تضادم سے عجیب عجیب الجھنیں پیدا ہوجاتی ہیں جو ذہن کیلئے بوجھ بکھیر دہ اور جاں گسل ثابت ہوتی ہیں۔ انسان کو زندگی میں مصروفیت، امید، نجات، سچائی، نظم اور اپنی ذات کی نشوونما کی راہیں کہیں نظر نہیں آتیں۔ پھر ناشور اور طریقے زندگی میں کارگر ثابت نہیں ہوتے۔ انسان خود کو تنہا، باپس اور تنہا حال پاتا ہے اور مختلف تاویل اس صورت حال کی کر کے خود کو مطمئن کرنا چاہتا ہے لیکن سولے یا پوسے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ کیونکہ امید مصروفیت، اور ذات کی نشوونما کے ذرائع تو نیا شور ہی پیش کر سکتا ہے اس لئے نفس اور ذہنی نظام اس وقت تک منتشر رہتا ہے جب تک اسے صحیح ارتقائی نظام حاصل نہ ہو۔

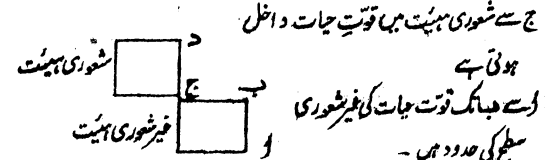
انقلاب کے سابقہ عبوری ادوار اور موجودہ عبوری دور

آج سے قبل پچھترہ عبوری ادوار تاریخ میں آئے وہ قوت حیات کی غیر شعوری ہیئت اور اسکے نامکمل پیلوڈ کی ارتقائی منازل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان عبوری دوروں کی وجہ سے قوت حیات کوئی بالکل نئی شکل دہیئت اختیار نہیں کرتی تھی یعنی ایک ہی نوعیت کے سادہ اور سلسل ارتقا کا سلسلہ تھا لہذا زندگی کوئی نیا حیاتیاتی پیمانہ نہ ملتی تھی مثلاً نباتات جینک نباتاتی ہیئت میں ارتقائی منازل طے کریں ان کا ارتقا ایک ہی نوعیت کا مکملہ گا۔ اور اگر وہ نباتات سے حیوانات کی ارتقا ہیئت اختیار کر لیں تو یہ ایک نیا حیاتیاتی پیمانہ نکلائے گا۔ انسان کی زندگی جیتوں اور رجحانات کے ہماؤ کے زور پر حیوانی ارتقائی ہیئت میں ہی چل رہی تھی ایک عملی ارتقائی ہیئت اختیار نہ کی تھی لیکن موجودہ عبوری دور میں یعنی ہماری قوت حیات کو انسانیت کی ایک اعلیٰ ہیئت میں منتقل کرنا ہے۔

غیر شعوری سطح ذہن کی انتہا جسکے بعد "سی" "سی" تک نہ پہنچنے سے قبل ادراک کے پیمانہ میں خلا میں باقی ذہن نئی ہیئت اختیار کرتا ہے۔
 سابقہ عبوری ادوار ذہن انسانی کو
 "سی" تک پہنچانے کا ایک ذریعہ تھے۔
 خلا میں جو ارتقا
 غیر شعوری ارتقا
 چکرے گا۔
 نئی سطح اختیار کرتی ہے کج ذہن "سی" تک پہنچ چکا ہے
 اور وہ نئی ہیئت کا منتظر ہے۔



آج تک قوت حیات غیر شعوری منزلوں میں درجہ بدرجہ ترقی پا رہی تھی۔ لیکن موجودہ دور میں قوت حیات غیر شعوری منازل طے کرنے کے بعد شعوری منزلوں میں داخل ہو چکی ہے۔



ج سے شعوری ہیئت میں قوت حیات داخل ہوئی ہے
 اسے جب تک قوت حیات کی غیر شعوری
 سطح کی حدود ہیں۔
 اول اول باقی سورتہ تک گرم ہوتا ہے اسکے بعد وہ بھاپ بنتی ہے۔ یہی حال قوت حیات کا ہے۔ اول اول وہ غیر شعوری سطح کی ارتقائی منزل طے کرتی ہے اور پھر ایک شعوری ہیئت میں داخل ہوتی ہے۔ موجودہ عبوری دور اسے سابقہ ہیئت میں ہی آگے بڑھانے کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ اب تو تمام قوت حیات ایلٹا۔ چون جولائی ۱۹۷۷ء

خود شعوری کی نئی ہیئت اختیار کر رہی ہے۔ اس لئے قوتِ حیات کے تمام گوشے اپنی طرح کھول رہے ہیں۔ ظاہر ہے موجودہ عبوری دور اور سابق عبوری دوروں میں نہایت فرق ہے۔ کیونکہ تمام قوتِ حیات اب نشو و ارتقا کی ایک نئی دنیا میں داخل ہو رہی ہے۔ اگر یہ نئی شکل سے گزیر نہ جاتا ہے تو ساری کی ساری فکائی میں آجاتی ہے۔ قوتِ حیات کا کوئی ایک جز، منزل، تعمیر میں نہیں ہے۔ بلکہ تمام کی تمام بیرونی منزل میں ہے۔ غیر ترقی یافتہ ادراک انسانی نئی ہیئت کو اگر قبول نہ کرے تو چونکہ غایتِ بلند ہوتی ہے۔ اس لئے پست ادراک اس سے ٹکرا کر واپس لوٹتا ہے۔ اور اپنی ہی ذات پر حملہ کرتا ہے۔ اس عمل سے انسان کی قوتیں خود کو بے بس محسوس کرتی ہیں اور زندگی میں ایک تشبیب کی سی حالت پیدا ہوتی ہے۔ انسان کا ادراک نئی ارتقا کی حدود سے نہ بچ سکتا ہے۔ نئی ہیئت کو بھانڈا کے آگے بٹھ سکتا ہے۔ اور ایک جود کی حالت موت کی سی کیفیت عادی ہو جاتی ہے۔ ایک جاگتی۔ ایک انتشارا را ایک نہ ٹکے والا اضطراب، زندگی پر ٹوٹ پڑتا ہے اور نئی ہیئت سے تطابق لازمی اور لا بدی بن جاتا ہے۔ پہلے عبوری دوروں میں چونکہ قوتِ حیات کو نئی ہیئت اختیار نہ کرنی تھی، بلکہ ایک بٹھتی ہوئی رو کی شکل میں چلتی تھی۔ اس لئے غیر ترقی یافتہ ادراک کی کسی ہیئت اور نئی سطح سے ٹکرانے کا مسئلہ ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اور غیر ترقی یافتہ ادراک پر کنٹرول بھی ہو سکتا تھا۔ سابقہ عبوری دوروں میں انتشار پھیل جاتا تھا۔ لیکن ادراک اور قوتِ حیات کو اس طرح مقید نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کیونکہ غیر ترقی یافتہ قوتِ حیات کو محسوس تو ایک نئی سطح اور ہیئت قوتِ حیات ہی کر سکتی ہے۔ آج نوعِ انسان پہلی دفعہ اس عمل سے گزر رہی ہے۔ اگر انسان مذہب کی طرف یعنی سماجی اور حقیقت کے ظنی تصورات کی طرف توجہ کرے۔ اور ان میں گم ہونا چاہے۔ تو احساسِ گناہ ادراک پر مستقلاً ظاہر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ادراک عملی طور پر آگے بڑھنے کی راہ تو پانچیں سکتا۔ وہ مستقلاً ایک تھقل کی حالت میں قائم ہے۔ یعنی ادراک کو گزرنے کے لئے بھی کوئی راہ نہیں ہے۔ اور مذہب نیک و بد اور گناہ و ثواب کے معیار کو ادراک کے سامنے پیش کرتا ہے۔ زندگی خود لغزشوں اور خامیوں کی رہ گزر ہے جہتک صحیح حیاتیاتی نظم قائم نہ ہو۔ احساسِ گناہ کی صورت میں سلسلِ ایک عذاب کی سی کیفیت کے سوائے ادراک کوئی حل نہ ملے گا۔ یہ بھی ایک حیاتیاتی قانون ہے۔ یعنی جب ادراک مقید ہو اور کسی غلط مکتب خیال کا خود ساختہ معیار ہی ہماری ذات کو دکراتا ہے۔ کیونکہ وہ مکتب خیال ادراک کو حیاتیاتی نشو و ارتقا کی راہ دینے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ (حیاتیاتی نشو و ارتقا کی راہ تو بنیادی حیاتیاتی شعور ہی سے سکتا ہے) یعنی جب ادراک اسیر رہتا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ نشو و ارتقا بھی اسیر ہے۔ اور یہ قید و بند کا احساس اس خیال میں تبدیل ہو جاتا ہے کہ فرضی مکتب خیال کو اچھی طرح نہ مانتے نہ نتیجہ یہ قید و بند ہے۔ اس خیال و احساس کی بنا پر ایک تکلیف دہ کیفیت اور جاگتی ذہن پر چھا جاتی ہے جس سے کوئی مفروضہ۔ ایک آزاد خیال شخص بھی بغیر خود شعوری حیاتیاتی اور ارتقا کی راہوں کے بے بس ہو کر رہ جائے گا۔ اور خود کو بسا ہوتا ہوا پائے گا۔ یہ حال آج کل تمام تحریکوں کا ہے۔ جنہیں کوئی راہ نہیں ملتی ہے۔ حکومتیں بھی کوئی راہ نہ پاتے ہوئے شکست خوردہ شخص کی طرح ہاتھ پیر مار رہی ہیں اور خود کو کھال ڈال رہی ہیں غرض ہر کہ جنک ادراک نئی منزل اور نئے خود شعوری ذہن سے تطابق نہ کر لے۔ نشو و ارتقا کی کوئی راہ نہیں مل سکتی۔ آج تمام نوعِ انسان کو نئی ہیئت ذہنی سے تطابق کرنے کی ضرورت ہے۔

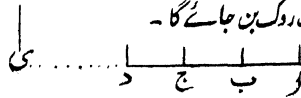
زندگی اور موجودہ نظامِ عالم کے درمیان ایک علیحدگی پیدا ہو گئی۔ یعنی موجودہ نظامِ عالم میں ہمارے جذبات اور قوتوں کا کوئی پاس نہیں ہے۔ ہماری زندگی موجودہ عبوری دور و نظامِ عالم کے چوکھٹے میں فٹ نہیں ہے۔ وہ قوت جو ہمیں متحد اور شیرازہ مند رکھتی ہے خود عبوری حالت میں ہے اور یہ عبوری حالت نوعِ انسان کی تاریخ میں ایک خاص نوعیت رکھتی ہے۔ پہلا مسئلہ ایک ایسا ماحول اور نظام قائم کرنا ہے۔ جو ہماری زندگی کی نئی ارتقا کی قوتوں کو راہ دے سکے اور وہ نظام خود شعوری ہیئت ذہنی کی مدد سے ہی قائم ہو سکتا ہے۔ کیونکہ موجودہ انسان کا ذہن اور ماحول اسی کا مقتضی ہے۔

ارتقا کی زندگی نئے ماحول اور فضا کی مقتضی ہے۔ موجودہ نظامِ غیر شعوری سطحِ ذہن کی انتہا کا نتیجہ ہے۔ اسی لئے نیا ماحول لازمی نئی خود شعوری ہیئت کے علاوہ قائم نہیں ہو سکتا۔

پُرانی زندگی کے لئے کافی تھا۔ اور پُرانی قوتوں کی بنا پر قائم ہوا تھا۔

موجودہ نظام عالم میں قوتوں کی بنیاد قائم ہو اکتا۔ وہ غیر شعوری سطح ذہن کے انتہائی نقطہ ارتقا کا نتیجہ ہیں۔ اب ارتقا آگے بڑھ چکا ہے وہ غیر شعوری سطح ذہن کا کوئی نقطہ تو نہیں سکتا۔ کیونکہ غیر شعوری سطح ذہن کے انتہائی نقطہ کی بنیاد وہ نظام ہی قائم تھا۔ جواب ٹوٹ رہا ہے۔ اس لئے اب خود شعوری ارتقا کے دو بین زندگی داخل ہو رہی ہے۔ اور موجودہ نظام خود شعوری ارتقا سے متعلق قوتوں کو جذب کر سکتا ہے اور اپنی کوئی راہ دے سکتا ہے۔ اور نہ روک سکتا ہے۔

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ تمام غیر ترقی یافتہ ادراک نئی قوت حیات اور خود شعوری ہیئت ذہنی کے جھلک میں مقید ہو گئی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے پورے کوہِ قیامت کی طرف رکھا جائے تو سایہ آنکھوں کے آگے ہی پڑے گا۔ اسی طرح حیاتیاتی اصول ہے۔ جب تک نئی ہیئت ذہنی کو رہنمائی نہ دیا جائے گا۔ غیر ترقی یافتہ ادراک پر اس کا سایہ پڑ کر ایک روک بن جائے گا۔



نقطہ شعوری ہیئت ذہنی کا نام اندہ ہے۔ جب تک سی کی بنیاد پر نظام عالم قائم نہ ہوگا ر ب ج د کے لئے سی ایک روک بن رہیگا اور ر ب ج د کی قوتیں سی کے بلند درجہ ذہنی کے سایہ کی وجہ سے مقید رہیں گی۔ پھر اے شعور اور ارتقائی قوتوں میں آج ایک زبردست کشمکش چلا ہے۔ پھرانا شعور نئی قوتوں کو قابو کرنے میں بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس لئے انسان کا پھرانا ادراک بے بسی میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں پھرانا نظام زندگی کے نئے جذبات اور مہجانات کی تسکین نہیں کر سکتا۔ اس لئے زندگی بے بسی میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ زندگی کی بے بسی اور بے کسی کا علاج نئی قوتوں کی بنیاد ماحول اور ادراک کو بلند کرنا ہے۔ اگر نئے ارتقا سے ہم آہنگ نہ ہو جائے۔ تو انسان تباہ حال اور بے مہیابی کا شکار ہو جاتا ہے۔ جب تک صحیح نظم قائم نہ کیا جائے پھرانا شعور اور ارتقائی قوتوں میں اندہ ہی اندہ ایک کشمکش جاری رہے گی اور زندگی بے مہیابی اور اضطراب سے نجات نہ پا سکے گی۔

۱۵

پھرانا شعور ————— نتیجہ بے بسی ————— نئے شعور کی ضرورت
پھرانا نظام ————— نتیجہ تباہ حالی اور بے کسی ————— نئے ماحول کی ضرورت
قوت حیات کی نئی شعوری ہیئت کی وجہ جسمانی۔ ذہنی اور بیرونی نظم میں تبدیلیاں
خود شعوری ہیئت ذہنی

جسم کی قوت مدافعت میں اضافہ۔
ادراک کا پھرانا مکمل ہو جائے گا۔ قوت حیات منتشر حالت میں نہ رہے گی۔ اس لئے صحت میں اضافہ ہوگا
جنون اور مجذومیت کا خاتمہ ہو جائیگا۔ عمر میں اضافہ لازمی نتیجہ ہوگا۔ ذہن کی صلاحیت بڑھ جائیگی۔ ناقص
اعضا والوں۔ ہروں۔ اندھوں۔ لوے لنگڑوں کی پیدائش بند ہو جائے گی۔
اعضائے جسمانی

جسمی خواہشات کی صحیح تسکین ہوگی۔ اعضائے جسمانی میں نقص نہ رہے گا۔ قوت حیات کے
نشہ و نمان سے اعضائے جسمانی کی صحت کا زبردست قلق ہے۔ صحیح نشہ و نمان یافتہ قوت حیات اعضائے
جسمانی کو بھی صحت اور قوت عطا کرتی ہے اور اس طرح جسمی تعلقات کی شکایات دفع کرنے میں معاون بنتی ہے۔
ایشیا۔ جون جولائی ۱۹۳۹ء

وقت حیات آزاد اور شعوری حیثیت میں توفی کرے گی۔ اس لئے ذہن آزاد (فہم)۔
 ذہن آزاد ذہن ہوگا۔ اسرا ختم ہو جائے گا۔ حوادث اور خطرات کا استیصال ہو جائیگا۔ موت کا پردہ
 ذہن پر فٹا ہو جائے گا۔

ہو۔ امداد و مدد ساشی ذرائع کی طرف سے اطمینان حاصل ہوگا۔ خود شعوری ترقی (خاندانی زندگی)
 کی وجہ سے بیوی اور شوہر میں تضادم اور اولاد کی سرکشی و فوج میں آئے گی صحیح نظام کی وجہ ساشی کا دھڑلہ ہو جائیگا
 مذاہب کا وجود باقی نہ رہے گا۔ عبادت ختم ہو جائے گی۔ کیونکہ یہ سب (سچائی اور اقرار)۔
 خدا تک پہنچنے کا ذریعہ تھے جب خود شعوری حاصل ہو جائے گی۔ تو دنیا کے لئے خدا ایک راز نہ رہے گا۔ دنیا
 کو خدا کی فہم کی منزل پہنچنے کے بعد عبادت کی کیا ضرورت رہتی ہے۔

توحید حیات کی نئی حیاتیاتی مہبت قائم ہونے پر مکمل سائنس پر (سائنس طبعیات اور طبیعیات)
 ذہن کو قابو ہو جائے گا اور یہ زندگی کی بہتری کے لئے کام کرے گی۔ حیاتیاتی سائنس میں حیرت انگیز انکشافات اور
 طریقے معلوم ہو جائیں گے اور نوع انسان کی توحید حیات پر قابو ہو جائے گا جس کی وجہ سے وہ سائنس کو غلط
 میں استعمال نہ کر سکے گی۔

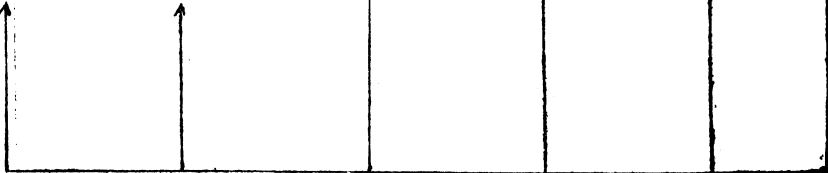
تمام نوع انسان کے ذہن میں کا ایک ہی فطری ارتقائی طریقہ زندگی ہوگا۔ نسل اور (تمدن)
 قوم کے قصورات ختم ہو جائیں گے۔ یہ جغرافیائی حد بندوں کے پیدا کردہ تھے۔ مخلوط شاخ دیاں ہوں گی اور ایک ہی
 زبان تمام دنیا میں عام ہوگی۔

تمام دنیا پر ایک صد کی حکومت ہوگی۔ جو خود شعوری ارتقا کا مناجندہ اور (حکومت)
 حیاتیاتی نقطہ نگاہ سے صحیح شعور کا حامل ہوگا۔ اور زندگی کی صحیح رہنمائی کر سکے گا۔ وراثت کا رد اور ختم کر دیا
 جائے گا۔ اجارہ داری اور طلب منفعت کے مواقع مسدود کر دئے جائیں گے۔

عالمگیر تبادلات کا قیام۔ کٹم ڈیوٹی کی تسبیح۔ فوج کا اختتام۔ جیلوں کو توڑ دیا۔ (سیاسی نظام)
 جائے گا۔ اور ایک پرمشور ہونے کے بعد ان کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ نہ فوج کی مستقل امن قائم ہو جائیگا۔

غلط مسائل اور کتابی علم اور ذہنی مکان کے بجائے آزاد ذہن زندگی کی جدوجہد (تعلیم)
 میں صحیح طور پر نشوونما کر سکے گا اور ترقی و انکشافات کی راہیں ہموار کی۔

خدا کی تیز ذہن پرست کا پردہ اوجھنا مستقل امن کا آغاز آزاد ذہنی شعوری اور شعوری ترقی توحید شعور اور توحید
 نوع انسان کے ادراک اور قوت
 ارادہ پر کنٹرول



خود شعوری مہبت ذہنی کے نتائج

ایشیا جہلان کا خاتمہ

اکرام حسین بی۔ اے
(مسل)

جدید بنگالی شاعری

”ٹیگور انسانوں میں ہمگیر انسان ہے۔ شاعری میں بے نظیر شاعر۔ اور ہمارا یہ عہد ٹیگور کا عہد ہے۔“ جدید بنگالی شاعری راہبندنا تھ ٹیگوری ہمگیر خلافت اور زندگی پسند شعری کاوشوں اور کاہشوں کی منت کش تعبیر ہے۔ ٹیگور کی شاعری سے قطع نظر اس کی شخصیت کا شعوری اور غیر شعوری اثر تمام شاعروں پر پڑا۔ یہ اثر گزشتہ پورے جنگ تک کافی گہرے نقوش اُبھار چکا تھا۔ جس نے تمام عالم کے مروجہ سماجی نظام کو بدل دیا۔

ہماری قومیت کا تمدنی سانچہ بنگال میں تیار ہوا جس نے زندگی کے ہر شعبہ میں تغیراتی نقطہ نگاہ پیدا کر دیا۔ مغربی علوم و فنون کا چرچہ پیدائشی بنگال ہی میں شروع ہوا۔ سیاسی و سماجی اصلاح کی صدا بھی وہیں سے بلند ہوئی۔ انیس تبدیلیوں کی بنا پر سیاسی، معاشرتی، اقتصادی اور ادبی تمام نظریات نئے معیار اور جدید ”کائنات“ پر لوٹے جانے لگے۔

بنگال ہمیشہ سے مغربی تحریکات کو جذبہ کرنے اور اپنے تمدنی معیار اور قومی ضروریات کے مطابق ان سے استفادہ کرنے کے معاملے میں پیش پیش رہا ہے۔ یورپ میں زندگی کے مختلف شعبوں میں تغیر و تبدل رونما ہوا جس نے نوینا بنگال کی وسعت فکر و خیال کو چمکا دیا۔ نئے زمانے اور نئے نظریاتی تغیرات کے ساتھ ساتھ آمد و شد کے نئے ذرائع، نشریات لائیکلی نئے ”گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ“ نے کسی قدر طاق عوام کے ہاتھوں میں پہنچا دی۔ دو مختلف قوموں کے درمیان شادی بیاہ کے معاملے پر بھی دیوار کیا حال تھیں اُسے ترقی پسند سماجی نظام کے حامل گروہ نے کچل دیا۔ تعلیم کی بڑھتی ہوئی رواج و رکنالوں کی طاعت اور اشاعت کی وجہ سے ملک میں تحقیق و تدقیق کا مادہ پرورش پانا جا رہا تھا۔ صنعت فلم سازی مغربی تحریکات کو ہند کی سرزمین اور پھر ترقی پسند ماحول تک لانے میں مدد و معاون ثابت ہو رہی تھی۔ اکثر بڑے شہروں میں مخلوط تعلیم کی وجہ سے حسنی نظریات و

تجلیات بدلی رہے تھے۔ قومی حکومت کا تقاضا، روس، جرمنی اور جاپان میں ہندوستانی پناہ گزینوں کے ذریعہ نئے سیاسی عقائد کی اشاعت، خصوصاً آئل انڈیا کے دو ممالک میں ملکیت کے بُت پاش پاش ہو جانے پر نئے رجحانات کی نشر و اشاعت نے زاویہ فکر بدل دیا۔ ”اجیت اڈھار“ کے مسئلہ نے بھی ایک حد تک سماجی زندگی کے کچھ حصے مروجہ نظام میں تبدیلی کی ایک لہر دوڑا دی۔

ٹیگور صرف ایک باکمال شاعر ہی نہ تھا بلکہ ایک ہشیار رہنما بھی۔ اُس نے نہ صرف بنگال کی روح کو جلا دی بلکہ وہ اُس کی روح کو پکایا اُسکی نظریں زندگی کے اُس اُلجھاؤ سے نکل کر اُن کے محل تک پہنچا جاتیں تھیں۔ اُسکے مذہبی مقالات معاشرتی تحریکات میں، ادبی مضامین ڈراموں اور ناولوں میں ہم ایسی سماجی ہیجان کو جھٹکا جو طوفان برپا کرتے ہیں لیکن اُسکی شاعری کے قالب سے قطع نظر اگر ہم ٹیگور کے انفس میں مضمون کو دیکھیں تو یہاں بھی وہی جہود اور بے حرکتی دیکھتے ہیں جو گوتم بدھ اور ارسطو سے منسوب ہے۔ ٹیگور اور اُسکے زمانے کے شاعروں کا امتیازی فرق موضوعات نہیں بلکہ شاعری کا تصور و تخیل ہے۔ ٹیگور کے خیال کے مطابق شاعری ذہنی شعور، علمیت اور ادراک کی لطیف لوح، نہر حیات اور خوشبودار رنما پر پروار انگرائی ہے۔ اور یہی ایک ایسا زینہ ہے جسکی مدد سے ہم زندگی کی ابدی ہجرت اور حقیقتوں تک پہنچ سکتے ہیں اُسکے نزدیک ایک بے تاب انسان یا ایک بے اختیار مسکراہٹ کی طرح شعر دل کی کیفیت کی تصویر بن جاتا ہے۔ لیکن ہمارے نوجوان بنگالی شاعروں کیلئے

شاعری محض حکایت زبان و بیان ہے۔ اُن کے نزدیک ہمارا خلائی شوق کو بیل کرنا ہی شاعری نہیں مگر (words words) کا ایمان تھا۔ یازدہ کی کے ادبی مسائل کی تقریب جیساکہ (Browning) کا شاعر

یہاں پہنچا ہے

نصب العین تھا۔ وہ اپنے مرقم سے نقاشی اور مہکاری نہیں کرتے جیسا
 ٹیکو نے اپنے شاہکاروں میں ہر جگہ کیا ہے۔ وہ ایک سائنس دان کی سطح
 انسانی زندگی کے ان جذبات و احساسات کا تجزیہ نہیں کرتے جو
 ہومر (Homer) کے زمانے سے آج تک جاری و ساری ہے
 نہ انہیں وہ پر شک و عظمت ہستی نظر آتی ہے جو ٹیکو کی شاعری میں
 چھائی ہوئی ہے۔

کولرج (Coleridge) اپنی مشہور تصنیف
 (Biographical Sketches) میں شاعری فطانت کے یہ
 لوازم قرار دیتا ہے۔ ”حسن لطیف شاعری فطانت کا جسم ہے۔ تصور اس کا
 صوری بنیاد ہے۔ ایک لکچر، ایک حیات بخش ترخہ، اہٹ اس کی زندگی اور
 عقل اس کی روح ہے جو ہر جگہ اور ہر ایک میں پائی جاتی ہے۔“ شاعری فطانت
 کے یہ لوازم کتنے ہی ضروری ہیں، نئے شاعروں میں کم و کیف ان کا فقدان
 ہے۔ وہ تجزیہ نفس تحت الشعور میں حکمت تامل رکھتے ہیں۔ وہ صوفی نعمات

(Imagery) اور لکچر (Imagery) اور لکچر (Imagery) اور لکچر (Imagery)
 پر مبنی ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک نظم کی ظاہری شان و شوکت، دقیق الفاظ
 رنگین تراکیب، بیدار تخیل، استعارے، دور اور کار تشبیہات۔ اسے زندہ
 رکھتی ہیں۔ (Word work) کا خیال ہے کہ تمام اچھی نظمیں ”تذت جذبات“
 پر مبنی ہوتی ہیں۔ (Symbolist movement) کے مخالف کے خیال
 کے مطابق بھی ”شاعری تخلیق خیال سے نہیں، الفاظ سے ہوتی ہے۔“ ان نئے
 روحانی شاعروں نے مغربی شاعری شعور کو اپنا یا اور تصور Imagist
 اور (Surrealist) شاعر (Donal Gascoyne) کا اتباع کیا۔ وہ انگریزی، امریکی اور غیر ملکی شعرا کی خوشامییبی کرتے ہیں۔
 جن میں سے چند نام حسب ذیل ہیں: -
 Massfield Blun, don Spender, Danies, Edith Sitwell,
 Walker De la Mare, Eliot, Pound, Poe
 Mallarme, Rim Land.....

اور بعض اوقات روسی کیونٹ شعراء کے اتباع سے بھی دکان
 نہیں بچاتے۔ لیکن ان شعراء کی ماہر الاستیاز خصوصیت یہ ہے کہ مغربی شعراء
 ایشیا میں پہلے پہل سے

”دوبان چاہتا ہے کہ اپنے آپ کو خوشبو بنا کر اُٹا دے!
 خوشبو چاہتی ہے کہ وہ ان کو اپنے سینہ میں چبائے رکھے!
 نعمت چاہتا ہے کہ شہر تال کا پا بند رہے،
 شہر چاہتا ہے کہ نغمہ کو لے کر اُڑھلے!
 خیال چاہتا ہے کہ جسم صوفیت میں جلوہ گر ہو“

کے اتباع کے باوجود ان کی ملکی روایات میں کوئی فرق نہیں آتا ہے۔
 اس مختصر مضمون میں یہ تو شکل ہے کہ تمام شعراء کے ذاتی رجحانات
 اور تحریکات شعری کا تجزیہ کیا جائے۔ لیکن جدید شاعری کی رفتار اور اس کی
 تدریجی ترقی کے اظہار کیلئے یہ ضروری ہے کہ چند مخصوص صاحب اسلوب اور
 مختلف خیالی اسکول کے شعراء کے کلام پر روشنی ڈالی جائے۔
 ٹیکو کی شاعری کی ماہر الاستیاز خصوصیت اس کا یہاں اختیار ہے
 اصل رنگ میں ان گیتوں میں سے ہر ایک اپنی سادگی، تازگی، جہتہ بن، معافی کی
 نزاکت اور بلندی، میان کی روانی، الفاظ کے حسن انتخاب، صوفیت، ترمیم اور
 شہر تال کی ندرت اور دلکشی میں شاعری اور موسیقی کا لاچار جواب نمونہ ہے۔
 ٹیکو انسانی آزادی کا علمبردار ہے۔ غلامی اور جبر و حقارت کی
 گود میں ملی ہوئی موجودہ تہذیب و تمدن کی دنیا میں وہ آزادی و فکر و عمل
 اور باہمی صلح و محبت کا پیامبر ہے۔ ٹیکو کی زندگی فرسودہ مینے معنی رسم
 رواج اور مردہ و پسویدہ مذہبی توہمات کے کھن بنڈھوں کو کاٹنے کی ہے۔
 ”مجھے معلوم نہیں عبادت کسے کہتے ہیں!
 جیسی تیرے دروازے کی خاک پر بیٹھا صوف رو یا کیا ہوں!
 میں بے سمجھ تھا، اور جس طرح میرے دل میں آجائیں چلا آیا!
 میں اندھیرے میں تجھ سے ڈرتا ہوں!
 لیکن یہ عارف تیرے،
 مجھے سخت طعنہ دیتے ہیں۔
 کہتے ہیں۔ توہان آئے کی مناسب سے نہیں آیا، لوٹ جا!“
 میرے لوٹنے کا راستہ تو میرے مندر رکھا ہے!
 اور وہ بیکار چارہ ہے میں ”لوٹ جا، لوٹ جا!“
 (اہ گیت - پنجشیکا)
 اور:-
 ”دوبان چاہتا ہے کہ اپنے آپ کو خوشبو بنا کر اُٹا دے!
 خوشبو چاہتی ہے کہ وہ ان کو اپنے سینہ میں چبائے رکھے!
 نعمت چاہتا ہے کہ شہر تال کا پا بند رہے،
 شہر چاہتا ہے کہ نغمہ کو لے کر اُڑھلے!
 خیال چاہتا ہے کہ جسم صوفیت میں جلوہ گر ہو“

اور صورت کی آرزو ہے کہ عالم خال میں آزاد رہے !
گرہ کا کھلنے کی فکر میں ، بنا ،
آزادی کا بخیروں کی آرزو کرنا ،
یہ عالم ہست نیست میں کی خوشی ہے جو کار فرما ہے !
(۲- گیت - اشک)

”میرا اندھیرا ہی بھلا ہے !
اپنے آپ کو روشنی کے خالوں کے لئے کا !
روشنی کا سر میں دیکھو ، نور کو کس طرح سے بیٹھتا ہے ۔
بس یہی طرح کا دھندلکا تباہ کن ہے !
بچے ماں کی گود میں اطمینان سے دودھ پیتا ہے ،
لیکن خور و عقد تیری باگاہ کے دروازے پر روک دیا جاتا ہے !
تیری راہ اچانک دروازہ خود دکھائی ہے !
پروردگار ! میں تیری اس راہ پر سیدھا چلوں گا !
اور وہ جو راستہ تھلنے کے لئے آجے ہوئے ہیں ۔
وہ تیری راہ میں سنگ راہ ہیں !“

(۳- گیت - پر دیا ہی بی)

”ٹیگور نے مروجہ تعلیم کے خلاف جہاد کیا ۔ اور وہ ”شواہد راتی“ کا
سنگ بنیا ورکھ کے یہ ثابت کر دیا کہ مصنوعی قید و بند سے آزاد ہو کر نام نہاد
حدود کو توڑ کر بھی حقیقی اور سچی تعلیم کی روشنی حاصل کی جاسکتی ہے ۔ ٹیگور نے
انسان میں انسانیت کے خدا کو دیکھا ہے اور اسی لئے اس کی نوعیت وہ کی سنگ
میں پرواشت نہیں کر سکتا ۔

”ٹیگور کی عظمت کا سنگ بنیاد ، اس کی لائٹنی شخصیت کا مدار وہ نہیں ہے
جو اس نے اس حسین دنیا کے تنہا حسن و سرور کی دوح بھونکنے والے شاعر
کائنات ”محض حسن ، محض سرور“ کی مدح و ثنا میں گایا ہے :
”خرف نہ کھاؤ کہ پہنام پر ایمان لکھتے ہوئے ،

پٹے بادباز میں بیٹے کو تان کر ،

میں اپنی کشتی کو کھیناؤں اس پار چائنا تاؤں !

میرا نہاد ہی ہے ۔

جو مجھے ہر حال میں دیکھ رہا ہے !

میرے دل میں کھٹکنا نہیں ۔

میں کشتی کا نجدھار میں چھوڑتا ہوں ،

مجھے اُس پر بھروسہ ہے !

دن دھلیے پر مجھے یقین ہے کشتی تیرے سہارے پار لے گی !

وہاں میں اپنے دردِ دل کے سرخ بھول کو ۔

تیری رحمت کے قدوں میں رکھ دوں گا !“

(۴- گیت - ملک دھارا)

”آہ میری راتیں ملے کیوں برباد ہو رہی ہیں ؟

آہ کیوں ہمیشہ اس کے مشاہدے سے محروم رہتا ہوں ۔

جس کتنے کا اثر میں اپنے خوابوں پر محسوس کر رہا ہوں !“

(نغمہ ۲۶- گیتا بھلی)

”میں تجھے اپنے خدا کی حیثیت سے جانتا ہوں اور تجھ سے علیحدہ ہو

میں تجھے اس ہی کی حیثیت سے نہیں جانتا جو میری ہو ، اور تجھ سے

قرب تر نہیں ہوتی ۔ میں تجھے اپنے باپ کی حیثیت سے جانتا ہوں

اور تیرے قدموں میں سرسجدہ ہوں ۔ میں تیرا ہاتھ اپنے دوست

کا ہاتھ سمجھ کر نہیں کھٹکتا !“

(نغمہ ۲۷- گیتا بھلی)

”ٹیگور نے وہ گیت ”میں نے جو مٹتی فطرت اپنے قدرتی مظاہر میں ہمیشہ

گائے جا رہا ہے اُس کا دل و دماغ انہی قدرتی گیتوں کے جواب سروں

گوںج رہا ہے اور وہ خود بخود سرور و نغمہ ہو کر گاتا ہے ۔ ٹیگور کا مہبود اور ذوق

وہ شاعر اور مصور ہے جو اُس کی زندگی میں لطف اور سرور غم اور اندھ کی ہر تباہ

پھونک رہا ہے ، اُس کی زندگی میں غیب و غریب کیفیات کے رنگ بھر رہا ہے ۔

شاعر اُس کے عشق میں اور اُس کے شوق و قدرت میں دھج کر اُس کی نفسانیت میں

نغمہ رہا ہے ۔

ایشیا کا عرفان ، اُپنڈندوں کا گیان ، جو شیوں کی خصوصیت تھا وہ ہمارے

دوسرے آزادی اور جدید علمی تحقیقات اور فلسفیانہ حقائق کی روشنی سے

مل کر ایک حیرت انگیز لافانی نوزونیت کی صورت میں ہم ٹیگور میں موجود

پائے ہیں ۔ ٹیگور اپنی شاعری کے عالم کا آپ ہی خالق ہے ۔ اُس سے

قبل کی بنگالی شاعری کی وہی حالت تھی جو اردو کی میرا درمزا غالب سے

المیاجون جولائی ۱۳۳۷ء

سے پہلے اُس نے اپنے مذاق کے مطابق عروض کے قواعد الفاظ کے ہتھکڑے
اور اظہار خیال کے میدان میں بھی اصلاحیں کیں۔ وہ خود کہتا ہے :-
”دل کی خوشی کے چڑھتے ہوئے سیلاب کے کپڑے کے سامنے
بندھی بندھائی عرض کی بھری اور وزن اپنی جڑیں میں
میں منجھال کر نہ رکھ سکے۔ اور جس طرح ہندی میسجی راہنہ بنی
اپنی ترنگ میں گھومتی، چکر کا پٹی چلی جاتی ہے، میرے ہتھکڑے
کے ہاویں بھی خود سری ہوتی۔“

قاضی نذیر الاسلام اسکے بعد نذیر الاسلام کی بہتی ہے، ٹھیکہ رنے خود
بار نذیر الاسلام کی شاعرانہ عظمتوں کو تسلیم کیا ہے۔ اس لئے ہم ٹھیکہ کے بعد
جنگلی کا سب سے بڑا شعرا نذیر الاسلام ہی کہہ سکتے ہیں۔ نذیر الاسلام کی شہرت
کی بنیاد اُسکی ”باغیاظ نظموں پر قائم ہے۔ کون اُسکی نظم ”باغی“ اور ”طوائف“
سے اٹھا کر رکھتا ہے۔ اُسکی نظموں میں مضمون کی مناسبت سے کچھ اس قسم کے
الفاظ ہوتے ہیں کہ ان میں ایک انقلاب انگیز گرج اور ولولہ انگیز شور
پیدا ہو جاتا ہے۔

نذیر موجودہ ملکی نظام، سرمایہ داری، بواؤں کی زبوں حالی،
مزدور کی کس پھری، اور سماجی بدحالی کے خلاف ہے۔ وہ کہتے ہوئے پیار میں
(Socialism) اشتراکیت کا پرچار کرتا ہے۔ اُسکے نزدیک ملکی
بدحالی کو دور کرنے کا ایک ہی واحد علاج ہے۔ چونکہ وہ خود سپاہی رہ چکا
ہے اس لئے اُسکی نظموں کا جوش، اُسکے ذہنی نشوونما کی وجہ سے اور زیادہ
بڑھ گیا ہے۔

وہ ایک باغی شاعر ہے اُس کی زیادہ تر نظموں حکومت اور اُسکی چہرہ
دستیوں کے خلاف صدائے احتجاج ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُسکے بیشتر مجموعے
ضبط ہو جاتے ہیں۔

اُس کی فنی اور انقلابی نظموں کا سننے شاعروں پر گہرا اثر پڑا۔ او
یہی دیکھتے تھے، ”اب وہ خاموش ہو گیا ہے۔“ (ٹھیکہ کے شرا کے موقع پر) نے
اُس سے مل کر یہی رائے قائم کی ہے، اب اس نے اپنا اصلی رنگ چھوڑ کر
محبت اور پیار کو اپنا موضوع شاعری بنالیا ہے۔ نذیر اس معاملہ میں جوش کے
بالکل عکس ہے۔ نذیر نے پہلے بغاوت کی آگ اُپھیلی اور پھر ”محبت“
اور ”پیار“ کے گیسو سوزا دیے۔ مگر جوش پہلے ایک نشاطی ورومانی شاعر رہا

بعد کو انقلاب اور اشتراکیت کے گیت گانے لگا۔

اب نذیر الاسلام رومانی شاعر ہے اور اُس کی اکثر رومانی نظموں
شعری لطافت کے لحاظ سے انتہائی مقبول ہوئی ہیں۔ بہت دلوں سے وہ
چھوٹے چھوٹے گیت نگہ رہا ہے جو فانی کی غزلوں کی طرح نرم و شیریں
ہوتے ہیں۔

نذیر الاسلام ایک غریب گھر کا چشم و چراغ تھا۔ بروان کے
ایک گاؤں میں وہ آج سے ۵۵ سال قبل پیدا ہوا۔ قدرت کی آغوش میں
پروان چڑھا۔ اسکول اور کالج کی تعلیم سے بے نیاز رہا۔ اٹھارہ سال کی عمر
میں فوج میں بھرتی ہو کر عراق چلا گیا۔ جنگ کامیڈان اسکے لئے سب سے
بڑی درس گاہ ثابت ہوا۔ جب لڑائی کے میدان میں ہندوستان کو لڑنا چاہتے
نظموں کے مسودے اسکے ساتھ تھے۔ ان کا مجموعہ ”اگنی و نیا“ (آگ کی
باشی) کے نام سے شائع ہوا۔ یہ آٹھ یا نو نظموں پر مشتمل ہے جس میں سے دو
کو چھوڑ کر باقی سب عراق میں لکھی گئیں۔ ان سب میں اسلامی ورومانی زندگی
کی دھڑکن پائی جاتی ہے۔ اور ان میں ہم ایک مسلمان انقلابی، ایک اسلامی
مجادد کی جھلک دیکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو اس زمانے میں اُسے آزادی کی لگن
اور ظلم سے نفرت تھی۔

کسان تو وہ ابتدائی ہی سے تھا لیکن عراق کی جنگ نے اُسے سپاہی
بھی بنا دیا۔ کسان سپاہی ہیں انقلاب گری کے بڑے بڑے امکانات ہنسا
ہوتے ہیں۔ بشرطیکہ اس کا ساتھ مزدور سے ہو جائے۔ کسان، مزدور اور
سپاہی۔ ان تینوں کا اتحاد دنیا کی تمام جابر سلطنتوں کا تختہ الٹ سکتا
ہے۔ ناز کا زوال اس حقیقت کا ثبوت ہے۔“

”مسلمان کی گرم گفتاری، کسان کی حقیقت پسندی اور سپاہی کا جوش۔
یہ تینوں چیزیں نذیر الاسلام کو وہ بعیت کی گئی تھیں۔ مزدور کی انقلابی مشرت کی
کمی تھی، مسودہ بھی بعد میں پوری ہو گئی۔“

عراق سے واپسی پر اُس نے اپنے خیالات کی تہذیب اور تعلیم کا موقع ملا
اسی زمانہ میں اُس نے ”وہ نظم و دروہی“ (باغی) لکھی جس نے اُسے ادبی انقلاب
کا پیشوا بنا دیا۔ برویسر سرکار اپنی کتاب ”ایشیا نقل“ (Asia's Migration)
میں اس طرح لکھتے ہیں،۔

”جہیں نے نذیر الاسلام کی نظم ”باغی“ کو پڑھا تو مجھے عجز

ہوا کہ گزشتہ دس سال سے ہم ہنگامہ ادب میں جس انقلاب کے متوقع تھے آج اُس کا آغاز ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ادب میں زندگی اور جوش کا ایک دریا بہرے مارنے لگا۔ مسلمانوں نے اپنا اپنی مادری زبان کی خدمت اتنی میں کی تھی جتنی انہی نے عامہ ہوتی ہے۔ لیکن اب ثابت ہوا کہ ہنگامہ کی سوتی ہوئی روح کو سید کر نیکاسر ہاشا دین ہی کے سر بندھنے والا تھا۔

”باغی“ ہنگامہ ادب میں اپنی نوعیت کی اچھوتی چیز ہے۔ وکٹر ہیوگو (طوفان) سکون برن اہرستجا، اور لارڈ بائرن (تخریب) جیسے نامیاد شعراء نے اس موضوع پر نظمیں لکھی ہیں اور شنگ کا ترا ”آزادی“ روسی انقلابیوں کے دلوں میں اتر چکا ہے۔ لیکن ”باغی“ کی عظمت اور بلندی ان سب سے بڑھ کر ہے۔ یہ ”باغی“ یونان کا رستم ہر گیس نہیں جس کی ٹانگیں آہنی سوتوں سے بڑاؤٹی تھیں بلکہ ہومر کا شکیل و جمیل ہیرو واکیلیس ہے جس کی تلواریں تانہی ہی کاٹ تھی جتنی کہ اس کے کچھری اٹھکوں میں۔

اگرچہ بغاوت کا ایسا خاکہ شکل سے کہیں ملے گا۔ لیکن پھر بھی اُس کے خیالات میں اس وقت تک پہنچنے اور صفائی نہیں کی تھی اور نہ اُس کا نظریہ زندگی ہی واضح ہوا تھا جس کی مثال ”نعرہ انقلاب“ میں ملتی ہے۔

”آگہنی“ (آدم) اور ”دروہی“ (باغی) نظموں نے ہنگامہ کے ادبی حلقوں میں ایک ہوجان پیدا کر دیا۔ قدامت پسندوں نے ان پر سخت شور مچایا۔ ان کی زالی سچ دھج ایک نئے دور کا اعلان کر رہی تھی۔ شیور اسکول کے مقلدین کو یاد نہیں رہا کہ انہوں نے بھی جگمگ چندرا اور ڈی۔ال۔ رائے کی روایات کو تو لکھا ہے۔ اُنے ایک نیا راستہ بنایا تھا۔ اس ادبی جہاد سے جوان اور بوڑھے دو گروہ میں بٹ گئے اور اُن کے بنامہ کی بنائندار اسلام کی شاعری قرار پائی۔

نذر الاسلام کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت وہ پیغام ہے جو وہ اپنے وطن کے نام لایا تھا۔ یہ اُن سرفروشیوں کا پیغام تھا جو انسانیت کی نجات کی خاطر دیں پر دیں میں سولیوں پر چڑھ رہے تھے۔ مگر اس پیغام سے قطع نظر اُس نے جس سلوب میں اس پیام کو دنیا کے سامنے پیش کیا وہ بھی کچھ کم از کم نہ تھا۔ شاعری یا ادب کے ہر شعبے میں طرزی اسلوب کو سب سے بڑا مہر بہ حاصل ہے۔ اور اچھے سے اچھا مضمون اسلوب کے نقص کی وجہ سے بے اثر اور بے جان رہ جاتا ہے۔ نذر الاسلام اس حقیقت سے اچھی طرح

واقف تھا اور اسی لئے اُس نے اپنے جذبات و احساسات کے اظہار کیلئے ایک ایسے اسلوب کی بنا ڈالی جو اُس کے پیغام کا حامل ہو سکے۔

ٹیکر کے بنائے ہوئے سانچے غنائی نظموں کیلئے انتہائی موزوں تھے۔ لیکن رزمیہ شاعری کی آج پڑتے ہی وہ مٹنے جاتے تھے۔ چنانچہ نذر الاسلام نے فارسی اردو کے سبک الفاظ کے چاؤ سے اپنی نظموں میں خاطر خواہ رد و اثر پیدا کیا۔ نذر الاسلام کی اس جدت نے ہنگامہ کے ادبی پاکستانوں (Pakistans) میں ایک الگ سی لگادی۔ ہر طرف سے اس پر اعتراضات کی لوجھاا شروع ہو گئی۔ اور اکثر Literary Philistines نے اسے فرقہ پرست اور رجعت پسند قرار دے دیا۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ کہنے لگے کہ جان کی خوبیوں کو سمجھ گئے اور اُس سلوب ہنگامہ کی فی مقبول ہو گیا۔ اب تو اس کے نتیجے میں غزل نگاری ہنگامہ شاعری کی خاص صفت بن گئی ہے اور اس صفت کا تحریک بھی نذر الاسلام ہی ہے۔

نذر الاسلام کو چونکہ چین ہی سے گائے جانے کا شوق تھا۔ لہذا ان میں اسے اس فن کو حاصل بھی کیا تھا۔ موجودہ عہد میں وہ موسیقی کا استاد اور مجتہد نا تھا تا ہے۔ اس لئے اُس کی نظموں میں ایک رزمیہ موسیقی پیدا ہو گئی ہے جو اس کی دوسری خوبی ہے اور جو اُس کے پیام کو پُر اثر بنانے کیلئے ناگزیر تھی۔

”پیغام کی نوعیت، زبان و بیان کی جدت اور طرز کلام کی قوت۔ یہ وہ خوبیاں تھیں جنہوں نے بہت کم عمر میں نذر الاسلام کو ہنگامہ کا سب سے عظیم مقبول شاعر بنا دیا۔“

نذر الاسلام نے حوالدری کی وردی چین جانے پر حکومت کے عتاب اور قدامت پرستوں کی مخالفت کی ذرا بھی پروا نہ کی۔ اُس کے عزم اور نصب العین میں بھی کچھ فرق نہ آیا۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۲ء کے عرصہ میں اس نے دو مہفتہ وار ”کھول“ اور ”نوروز“ جاری کئے لیکن سیاست گنگامہ کے ختم ہونے پر ہندو مسلم فساد کی وجہ سے انہیں بند کرنا پڑا۔ لیکن ”کھول“ کا اثر غیر شعوری طور پر ہنگامہ کی دماغ پر بھجا بار آیا۔ اور ”کھول اسکول“ کے ادیب یورپ کے رومانی ادیبوں کی طرح اپنے لئے ایک خاص مقام بنا گئے۔ انہیں نے مولویوں اور پندتوں کی زندگی کو بے نقاب کر کے اُن کے مجھوت کو بے نقاب کر دیا۔ ان ادیبوں میں سے کچھ نے نذر الاسلام کے ساتھ ہوجا کی انقلاب

کو اپنا اصلی مقصد بنالیا۔ اور کچھ ”جیس جونس“ اور ”فرائڈے“ سے متاثر ہو کر جنسی اصلاح میں کھو گئے۔

۱۹۲۵ء نذرالا سلام کے لئے بڑا مغوس ثابت ہوا۔ اس کے مرنے سے سی۔ آر۔ داس کا انتقال ہو چکا تھا۔ کوئی اس کی پشت پناہی پر نہیں رہا تھا۔ مخالفت کا ایک شور بلند ہوا۔ اپنے اس دشمن اسکی آواز کو حذب کر لینے کے لئے۔ ہندو مسلم فساد کی وجہ سے ملک کی جو حالت تھی اس کی وجہ سے وہ فرقہ پرست کے نام سے سرفراز کیا گیا۔ اسی دوران میں اس نے ایک ہندو لڑکی سے شادی کر لی۔ پھر کیا تھا۔ فرقہ پرست اسکی جان کے دشمن بن گئے اور ہر طرف سے اعتراضات کی آگ اٹھالی جانے لگی۔ حکومت کی چیرہ دستیوں، مولویوں کا غصہ اور اب ہندو جماعت کے ستم کو وہ اپنی ایک نظم میں اس طرح بیان کرتا ہے:-

”میں زمانہ حال کا شاعر ہوں، مستقبل کا پیغمبر نہیں ہوں۔

کوئی گستاہے اگلے زمانے میں مجھے کون یاد کرے گا۔

کوئی گستاہے شاعر کو قید و بند سے کیا واسطہ۔

کوئی گستاہے وہ بارہ جیل جاکر وہیں خوب لکھ سکتا ہے۔

مولوی میرے چہرے پر اسلام کی علامت (ڈائری) پہن پا کر

ایسی سے اپنی ڈائری کھانے لگتا ہے۔

ہندو کہتے ہیں کہ اس نے ہندو لڑکی سے شادی کر لی ہے،

لہذا یقیناً فرقہ پرست ہے۔

گاندھی جی مجھے پرستش و پسندی کا الزام لگاتے ہیں۔

عورتیں کہتی ہیں کہ یہ دشمن نسواں ہے اور مرد مجھے عورت پرست

بتاتے ہیں۔

غرض کہ میری جان ضیق میں ہے۔

لوگو! مجھے اسکی پروا نہیں کہ مستقبل مجھے یاد کرے گا یا نہیں۔

مناصرت یہ ہے کہ جو لوگ خلق خدا کو بھوکوں توڑ پارہے ہیں،

میری خوشچال تحریر ان کے لئے پیام موت ثابت ہو۔“

افلاس اور غربت، اگر سنگی اور بیچارگی نے اس کی فداوت گری کا گلا

مسوس دیا اور مجبور ہو کر اسے وہ گیت لکھنے پڑے جو آج جنگال کے

بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ جن میں ادب سے زیادہ موسیقی کو دخل ہے

اور یہی رنگ اب اسکی شاعری پر غالب آچکا ہے۔ اس کی انقلابی شاعری ۱۹۲۳ء سے شروع ہو کر ۱۹۳۵ء تک سرد ہو گئی۔

نذرالا سلام کی شاعری کو تین مختلف ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ابتدائی دور ترکیب خلافت کے ساتھ شروع ہوا۔ اس زمانے میں ”اندیشہ“ اور ”مصلحت کمال“ برد و چھوٹے چھوٹے رزمیہ منظوم مکالمے لکھے۔ محرکہ کر بلا پر بھی چند نظمیں ہیں۔

دوسرا دور ”بانی“ کی اشاعت سے شروع ہوتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بنگال میں بم بنائے اور پھینکے جارہے تھے۔ نوجوانوں کے دلوں میں جوش اور امنگ کا دریا لہریں مار رہا تھا اور ”Jehonmard“ پارٹی زور پکڑ رہی تھی۔

تیسرا دور ۱۹۳۵ء سے شروع ہوا۔ یہ نذرالا سلام کا اشتراکی دور کہلاتا ہے۔ اب وہ زندگی کے فلسفہ کو پا گیا۔ مزدور کی گرد سے اپنی ہوئی پیشانی، طوائف کے آنسوؤں کی رنگین عورت کا درجہ، فلسفہ ”حاکم و محکوم“، دو گناہ، ”کی چاشنی، سچائی کے زہر کے ساتھ ساتھ“ بنگال کی زمین کا قدرتی رومان اُسپر شکر ہی گیا۔ ”وہاں کے اودے اودے اودے اودے“ گئے بیڑوں اور ڈبڈبائی ہوئی ندیوں کے پیچھے روان مسکراتا ہے۔“

نذرالا سلام پہلا بنگالی شاعر ہے جس نے اپنے زمانے اور اسکی توجہ و روایات کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ وہ ایک آفتاب تازہ کی تلاش میں تھا جو موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کو کھل کر قوم و مذہب، رنگ و نسل کی حدوں کو توڑ کر دنیا کو مساوات اور آزادادی کا درس دیتا ہے اور اس نئے دور کا وہ یوں اعلان کرتا ہے:-

”وہ مبارک ساعت آجیہی۔

ہوڑی اور گڑالی سے جو بارشوں کو کاٹ کر رکھ دیتا ہے،

راستے کے کدوؤں طرف جس کی ہڈیاں بکھری پڑی ہیں،

تمہاری خدمت کیلئے جس نے قلمی اور غرور کا روپ لیا ہے،

تمہارا بارگاہ اُٹھانے کے لئے جو ہمیشہ خاک آلود رہتا ہے،

دہی۔ صرف وہی مزدور مکمل انسان ہے۔ میں اُسی کے

گیت گاتا ہوں۔ اس کا ٹوٹا ہوا دل ایک نئی دُنیا کی
تغیر کرے گا۔

آج مظلوموں اور بیکسوں کے خون سے رنگ کر لیں گے
سے آفتاب تازہ پیدا ہو ہے۔

آج دُنیا کے بندھن کٹ نہ گئے ہیں اور ایک عظیم الشان
دور بیداری کا آغا ہو رہے۔ جسے دیکھ کر خدا مسکراتا ہے
اور شیطاں خوف سے لرزتا ہے۔

نذر الاسلام کے نظریے کے مطابق ”زندگی دائم و قائم ہے اور انسان
لاشربک لئلا اس کا کارسا نہ ہے۔ وہ شباب کا ہمدوش اور انقلاب کا غیب
ہے۔ وہ تغیر کا حامی اور جمود کا دشمن ہے۔ وہ قدامت کا حریف اور جدید
علمبردار ہے۔ وہ قدرت اور سماج کے مظالم کے خلاف علم بغاوت بلند
کرتا ہے اور شاعری کو اس ہم میں جنگ کی دیوی بنا دیتا ہے۔ اس کے
نزدیک انسان سب سے افضل اور مکمل ہے۔

”ہر ناپائی خودی کے علاوہ کسی کے آگے سر نہیں جھکتا۔

میں اس بوجہ سماج کا دشمن اور اسکے لئے خطرہ عظیم۔
میں خدا ہوں! میں حقیقی سنویر ہیں۔

نذر الاسلام کی شاعری امید و اُمتنگ کا سپینام ہے۔ چونکہ ابھی تک
ہنگامہ شاعر زندگی کی بے قربانی اور انسان کی بے چارگی کا رونا روئے آئے
ہئے۔ اس لئے اُس کی شاعری نے ہنگام کو ایک نیا زاویہ فکر اور ایک جدید

خیال دیا جس نے ناامیدی کو امید، یاس کو اُمتنگ اور قنوطیت کو تفاؤل
میں بدل دیا جس نے شاعری کی مُردہ رگوں میں زندگی کا خون گرم دوڑا دیا
اُس سے پہلے کے شاعروں کا خیال تھا کہ حقیقت صرف موت کے بعد
مل سکتی ہے۔ لیکن کبیر داس کے بعد نذر الاسلام ہی نے اُس بات کو
یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ جو شے زندگی میں نہیں مل سکی وہ موت کے بعد کیونکر
مل سکتی ہے۔ اُس نے ”الطی شاعری“ **آہستہ آہستہ** **زندگی و موت**
کے تار و پود کو حلا کر اُس کی گرمی اور وحدت سے انقلابی شراب نیار کی
جس سے آج میٹاے قیوم رہے ہیں۔

نذر الاسلام نے کبھی دوئی کا پردہ اٹھانے کی کوشش نہ کی وہ
اسے سعی لا حاصل، بیکار مشغول اور فضول ہی تک دو و خیال کرتا ہے
اسکے مقابلے میں زندگی کے حقائق کو سلجھانا اور سمجھنا اس کا محبوب ترین
شغل ہے۔ اسی لئے اُس نے صرف دُنیوی زندگی اور اُس کے مسائل سمجھنے
سمجھانے میں اپنی تمام تر کوشش صرف کی۔

زندگی اور اُس کے غنیمت فراز کا مطالعہ کرنے کے بعد اُس نے
یہی دیکھا کہ ایک طرف انسانوں کی اکثریت جمالت اور افلاس میں گھٹ رہی
ہے اور دوسری طرف اُس کی محنت کا پھل چند آرام طلب غنیمت پر منحصر ہے۔ ایک
طرف جنت بوس محل کھڑے کئے جا رہے ہیں دوسری طرف بے داروں، بھونچروں کے
اندراپنی بھوکی آنتیں مسو سے پڑے ہیں۔ نذر الاسلام سے یہ بڑوں، غلامی اور
نا انصافی نہ بچتی تھی۔ اور ”باغی“ انہیں خیالات کی ترہائی کرتا ہے۔

خوشخبری

ہمارے یہاں مختلف امراض کا علاج ادویہ، تعویذات و عملیات کے ذریعہ کیا جاتا ہے اسکے علاوہ
مردانہ پوشیدہ امراض کا علاج بھی شرطیہ کیا جاتا ہے۔ آزمائش شرط ہے۔

المش
عامل کامل حکیم روحانی صوفی مشتاق الحی حشقی صابری صدر بازار گنسا محلہ ٹھہر

اکرام قمری۔ لے

روما کے سیاسی افکار

(۱) یونان کی بجائے روما

افلاطون اور ارسطو سے زیادہ متضاد و متباہن دو بلند پایہ مفکر تلاش کرنا محال ہے۔ ایک فلسفی اور استنباطی (کسی کلیہ سے جزئی نتیجہ اخذ کرنے والا) تھا، دوسرا سائنسی اور استقرائی (جزئی مثالوں سے کلی نتیجہ اخذ کرنے والا)۔ ایک ترکیبی (متفرق خیالات کے ربط اور ترتیب سے کلی نظریہ قائم کرنے والا) یا مستعد (نظریوں کو ربط و دیگر نظام فلسفہ بنانے والا) تھا، دوسرا تخلیقی (کسی چیز کا تجزیہ کر کے اس کے عام اصول معلوم کرنے والا) ایک داخلی (اشیا اور خیالات کو اپنی اصلی صورت میں نہیں بلکہ مصالح کے نقطہ نظر اور ذاتی رجحانات کے مطابق پیش کرنا والا) تھا، دوسرا خارجی (اشیا اور خیالات کو اصلی و حقیقی رنگ میں دیکھنے اور بیان کرنا والا)۔ ایک خیال پرست تھا، دوسرا حقیقت پرست۔ ایک کے نزدیک عقل زندگی کی بلند ترین رہبر ہے، دوسرا جبلت کا قائل ہے۔ ایک کا خیال ہے کہ فلسفیوں کے ہاتھوں سے سچ اور ریاست میں اعتدال و ترمیم کی جاکتی ہے۔ دوسرا رواج، عادات اور روایات کو مستقل اور ناقابل تغیر سمجھتا ہے۔ گرد و نوں اس بات پر متفق ہیں کہ یونانی شہری ریاست ایک معیاری طرز حکومت ہے۔ دونوں کو اس کا اعتراف ہے کہ ان کے وقت کی یونانی شہری ریاست ایک معیاری طرز حکومت ہے۔ دونوں کو اس کا اعتراف ہے کہ ان کے وقت کی یونانی شہری ریاست کے بہت سے بیرونی اور اندرونی طاقتور دشمن ہیں۔ دونوں کا یہ اعتقاد ہے کہ قلعیم سے — ایسی تہمت شہرت سے جو ظلم اور استبداد میں اضافہ کرے — شہری ریاست کی اصلاح اور تحفظ ہو سکتا ہے۔

لیکن ان کا یونانی شہری ریاست کا نظریہ غلط تھا۔ اس کا زمانہ ختم ہو چکا تھا اور اس کی جگہ پر الا قوای شہنشاہیت نے لے لی تھی۔ ارسطو نے خود ان لوگوں کی تربیت میں مدد کی تھی جن کے ہاتھوں بعد میں یونانی آزادی کا خاتمہ ہوا۔ اور مغرب میں پہلی عالمگیر حکومت کا قیام عمل میں آیا

ایضاً جون جولائی ۱۹۷۷ء

یونانی شہری ریاست کے زوال کی فوری وجوہات مندرجہ ذیل تھیں:۔
(۱) اندرونی سخت بدعمری۔ اسکی ارسطو فیئر نے اپنی طریبات کیا انتہائی مذمت کی ہے۔

(۲) بڑی ریاستوں نے چھوٹی ریاستوں پر وحشیانہ مظالم کئے اس سلسلہ میں وہ جبکہ استبداد خاص طور پر قابل ذکر ہے جو ایتھنز والوں نے اگیس شہروں پر کیا اور پارٹانے پہلو پونیشین شہروں کے ساتھ اور تھیبز کی حکومت نے پونیشین شہروں کے ساتھ وار کھا۔

(۳) بڑی بڑی ریاستوں کا باہمی جنگ و جدل۔ خصوصاً ایتھنز اور سبارٹا (۴۷۷-۴۳۱ ق۔م) کی پہلو پونیشین جنگ۔ اور

(۴) ہخند و نڈی حملہ اور فتح جو ۸۳۳ ق۔م کی جنگ کیرونیامیر پائر نکمیل کو پہنچ گئے۔

گمراہی ان کی فوری وجوہات کے علاوہ یونانی شہری ریاست کی ساخت ہی میں بہت سے عیوب موجود تھے جنہوں نے بیات نامکون بن پندیدہ بنادی تھی کہ اس ریاست کو انسانی تنظیم کی آخری صورت سمجھے ہوئے زندہ رہنے دیا جائے۔ یونانی شہری ریاست بہت ہی چھوٹی بہت ہی الگ تھلک، بہت ہی خود غرض، بہت ہی جھگڑالو، بہت ہی مستبد، فرقہ بندیوں میں بہت ہی ہری طرح جکڑی ہوئی، بہت ہی غیر مستحکم، اور غلامی کے ادارے کے ساتھ بہت ہی ہری طرح جکڑی ہوئی تھی۔ اس لئے بقا و دام کے خداوندی انعام کی یہ مستحق نہ تھی۔

یہ جگہ اس مشہور کہانی کے بیان کے لئے موزوں نہیں ہیں یہ بتایا گیا ہے کہ فلپ شاہ مقدونیہ نے کس طرح یونانیوں کو تاخت و تاراج کیا اور اسکے بیٹے اسکندر اعظم نے (۳۳۶-۳۲۳ ق۔م) کس طرح مقدونیہ شہنشاہی قائم کی۔ صرف ہی تھلا دھنکا کافی ہے کہ تیرہ سال کے مسلسل و مجتہد العقل جنگوں کے بعد اسکندر اعظم ایک ایسی حکومت کے قیام میں کامیاب ہو گیا جو گلیا ایڈریا ٹانگ سے لیکر جزائر شرقیہ الہند تک پنا

کے مشرق و مغرب کو محیط تھی۔ جہاں تک یونانیوں کا تعلق ہے اس حکومت کے قیام کی دوجوہات تھیں۔ اول یہ کہ یونانی شہری ریاستوں کی آزادی سلب ہو چکی تھی اور وہ ایک وسیع فوجی شہنشاہی کی بلدیات بن گئی تھیں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ یونانی تہذیب دنیا کے ان دور دراز خطوں تک پہنچ چکی تھی جہاں کسی یونانی کے ابھی تک قدم بھی نہ گئے تھے۔ یونانی اور بربری کا غیر متصفانہ فرق ختم ہو چکا تھا۔ مشرق نے یونانی تہذیب کو اپنایا تھا اور یونان نے ایک عالمگیر صورت اختیار کر لی تھی۔ اندر میں حالات آزاد شہری ریاست کا یونانی سیاسی نظریہ نروس اور بے عمل ہو گیا۔ شہرین سے بہتر زندگی مفقود ہو گئی۔ شہسری کے لئے سیاسی زندگی میں کچھ جاذبیت باقی نہ رہی۔ ریاست اور فرد کی ہم آہنگی جاتی رہی۔ غیر ملکی اور دور دراز کی ایک شہنشاہیت نے غلام دنیا کی زندگیاں اور قیمتیں ناقابل تدریس طریقہ پر ختم کر ڈالیں۔ ریاست کا دائرہ بہت زیادہ وسیع ہو گیا۔ مگر شخصی دائرہ مختصر اور محدود ہو گیا۔ آزادی اور خود مختاری جاتی رہی اور زندگی میں سیاسیات کیساتھ زیادہ دلچسپی باقی نہ رہی

یونانی سیاسی نظریے نے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق کس طرح تبدیلیاں اختیار کیں؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض ایسے سیاسی مفکر تھے جنہیں یا تو یہ تبدیلیاں دکھائی ہی نہ دیتی تھیں اور یا وہ انہیں دیکھنے سے انکار کرتے تھے۔ وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ شہسری ریاست کو اسکندر کے جانشینوں کے عہد حکومت میں بھی وہی آزادی حاصل ہے۔ جو ایرانی جنگوں کے زمانہ میں موجود تھی۔ برقلیدس اور پونیکس کی قوم کے فلاطونیوں اور بطونیوں کے سے ارسطاطالیسیوں کے درمیان ابھی تک ریاست اور فرد، اشتہائیت (مال کو قوم کی مشترکہ ملک بنانے کا اصول جس کی رو سے ہر فرد کو حسب قابلیت اور حسب ضرورت حصہ دیا جائے) اور شخصی ملکیت، اور اشتہائیت و جمہوریت کی قسم کے مسائل پر بحث جاری تھی۔ ان فرسودہ فلسفیوں کی قدامت پسندی کا نمازہ لگانا آسان ہے۔ یہ حقائق کے مقابلہ کے لئے تیار تھے۔ یونان کے علم سیاست صرف فلسفہ ریاست ہی پر مشتمل نہ تھا۔ یونانیوں کے نزدیک ریاست سراج فرد اور تمام ملک و سرے سے وابستہ اور مشتاق تھے۔ چنانچہ ان کا علم

ریاست موجودہ علم سیاست سے زیادہ وسیع تھا اور فلسفہ حیات، اخلاقیات، مابعد الطبیعیات اور دنیاویات کو محیط تھا۔ یونانیوں کا کوئی مندر ریاست سے جدا نہ تھا اور ان کا کوئی بھی مذہب سیاسیات سے علیحدہ نہ تھا۔ اس لئے ان کی تمام تر سماجی، اخلاقی، اور مذہبی سرگرمیوں کے لئے جنہیں کج کل سیاسیات سے علیحدہ ادارے سمجھا جاتا ہے شہری ریاست ایک مرکزی نقطہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ شہری ریاست کا نظریہ صدیوں سے رائج تھا اور اس کا اثر بڑی مشکلوں کے بعد زائل ہوا۔ شب گزشتہ اور ظلمت پسند فلاطونیوں اور ارسطالیسیوں کے علاوہ چند اشخاص ایسے بھی تھے جو حقائق کا مقابلہ کرنا چاہتے تھے اور سیاسی فلسفہ کو اسکندری عہد کے واقعات کے مطابق دکھانے کے خواہشمند تھے۔ ان میں سے اپیکوریس (یونانی حکیم اپیکوریس) سنیق (م) کے پیر۔ اس حکیم نے انسانی افعال کا منشا نے مقصود حصول لذت قرار دیا تھا، اور روائی درواقعیت کا فلسفہ زہبو نے سنیق (م) میں اتھنز میں قائم کیا تھا۔ اس میں صرف نیکی زندگی کا مقصد قرار دی گئی تھی اور جذبات کو ضبط کرنے اور لذت والہ کے احساس سے آزاد ہو جانے کی تعلیم دی جاتی تھی (خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اب ہم ان کی طرف توجہ کرتے ہیں مگر اس سے پہلے ہم یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ اسکندر اعظم نے جو شہنشاہی قائم کی تھی چونکہ وہ استسخر و مضبوط نہ کر سکا تھا اس لئے اس کی موت کے جلد ہی بعد اس کے حصے بکھرے ہو گئے۔ کچھ عرصہ تک اس سلطنت کے تین بڑے بڑے حصوں۔ مقدونیہ، شام اور مصر نے اپنا ایک کزور مگر علیحدہ وجود قائم رکھا۔ لیکن آخر کار یہ سب۔ مقدونیہ سلطنت (م) میں شام سلطنت (م) میں، اور مصر سلطنت (م) میں رومی حکومت کے ماتحت آ گئے۔ یونان بھی مقدونیہ کے ساتھ ہی رومانی فتح کر لیا۔ درحقیقت رومانی اسکندر کا صحیح جانشین اور اس کی حکمت عملی کا صحیح پیرو تھا۔ رومانی مقدونیہ کی طرح یونانی اثر قبول کر چکا تھا۔ اس کی تہذیب یونانی تھی۔ اس کی تہذیب یونانی تھی۔ اس کی زبان، اس کا ادب، اور قانون، اس کے فنون لطیفہ اور سیاسی نظریات سب کے سب اسی تمدن سے متاثر ہوئے تھے۔ جس کا منبع اتھنز اور مبلغ اسکندر تھا۔

(۳) ایپیکوریسی اور رواقی

ایپیکوریسیوں اور رواقیوں کو اس امر کا اعتراض تھا کہ کسی وقت آزاد شہری ریاست کا نظریہ کامیاب تھا۔ لیکن یہ کہتے تھے کہ وہ زمانہ ناب ختم ہو چکا ہے اور سیاسی زندگی میں ہر اچھے شہری کے لئے کشش نہیں ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ریاست اور فرد کی ہم آہنگی ختم ہو چکی ہے اور دوبارہ قائم نہیں ہو سکتی۔ ان کے نزدیک اچھی زندگی کا مطلب سیاسی مسائل سے گریز و اجتناب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان خیالات کا اقرار ایپیکوریس (۳۴۰-۳۰۰ ق م) اور رواقی مکتب خیال کے بانی قیو (۳۶۰-۲۷۰ ق م) دونوں کے لئے آسان تھا کیونکہ بیشتر لوگ گریہ انہوں نے وطن بنالیا تھا اور دونوں ہمیں تعلیم دیتے تھے مگر ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی شہری ریاست کا باشندہ نہ تھا۔ ایپیکوریس جزیرہ ساموس میں پیدا ہوا۔ اسی سال کی عمر میں ایتھنز چلا آیا۔ اور فلاطونی مدرسہ میں داخل ہو گیا۔ اُس وقت افلاطون کی وفات کو تیس سال ہو چکے تھے اور سکندر کے درخشاں مگر عارضی عہد حکومت کے المناک خاتمہ کو ایک سال گزرنے لگا تھا۔ نیز اس سے بھی زیادہ دور دراز علاقہ

۳۴

کا تھا۔ اسکے باپ کا نام نو فیٹس اور اس کا وطن ساموس میں تھا۔ اسکے ذریعے یونانی فلسفہ میں ایک خاصہ مشرقی عنصر داخل ہو گیا۔ اپنی سبک تحقیق کے دوران میں اس نے شہری ریاست کو چھوٹا آنک نہیں۔ ایپیکوریس نے افلاطون اور ارسطو کے نظریات کو ترک کر کے انفرادیت (اس نظریہ کی رو سے فرد کو ہر طرح کی آزادی ہونی چاہئے) کو قبول کیا۔ اور سوفسطائیوں کے مذہب لذتیت (یہ عقیدہ انسان کا مقصد زندگی حصول لذت ہے) اور فلسفہ افادیت (یہ اصول کہ جو کام اپنے لئے مفید ہو وہی اچھا ہے) کی طرف رجوع کیا۔ اس نے یہ تعلیم دی کہ صرف فرد کی شخصیت ہی اہمیت رکھتی ہے، مسرت زندگی کا مستہا ہے اور ریاست اس مسرت کے حصول کا صرف ایک ذریعہ ہے ریاست ایک مصنوعی چیز ہے جس کی بنا معاہدہ عمرانی یا رسم و رواج پر ہے۔ قانون کا مقصد محض افادی ہے۔ انصاف کی کوئی خارجی زندگی نہیں۔ مذہب صرف ایک من گھڑت افسانہ ہے جو انسانیت پر بڑبڑاتی ٹھونسا گیا ہے۔ اگر حکومتیں اپنی مضبوط اور سختیوں کو وہ امن امان

قائم کر کے ایک فرد کو حصول مسرت کے لئے کوشاں ہو سکیں تو ان کی اقسام ناقابل توجہ ہیں۔ ایپیکوریسی معاملات عام میں بالکل دخل نہیں دیتا اور اس کا رجحان طبع صرف اپنی ذات کیلئے راحت آرام حاصل کرنے کی طرف ہے۔ اُس کے مسلک کو بالکل مڑانیں کہا جاسکتا استکمال نفس، نفس پرستی کے مترادف نہیں۔ مگر ایپیکوریسیت کا عملی نتیجہ عموماً بدترین بد اخلاقی اور سماجی فرائض سے مکمل انکار ہوا ہے چنانچہ ایپیکوریسیت رومیوں کیلئے چنداں ماذب نظر ثابت نہیں ہوئی کیونکہ ان کی روایات کی وجہ سے سماجی فرائض کا احساس کئی گھٹیں میں پڑا تھا۔ مگر کٹین کی مشہور نظم اور ہورس کے مختلف اشعار ہی لاطینی علم ادب میں ایپیکوریسی فلسفہ کی تائید کرتے ہیں۔

روایت نے رومیوں بہت مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ مقبولیت اس نے یونانی میں حاصل کی تھی اُس سے بھی زیادہ۔ یہ ایک عہد، بلند اور سخت گیر مسلک تھا۔ اس نے سینیکا اور مارکس آرلیس کے سے سلطنت روم کے بلند دماغوں کو بھی اپنا سرگرم حامی بنالیا تھا۔ یہ مسلک عیسائیت سے بہت ملتا جلتا تھا اور اس نے سینٹ بال کی تبلیغ کیلئے راستہ صاف کر دیا تھا۔ رواقیوں نے حصول مسرت کی بجائے فاض کی ادائیگی کو اپنا مطمح نظر قرار دیا۔ وہ سکین و اس کے متلاشی تھے گراہنی تمام تر خواہشات کی تکمیل کے ذریعے نہیں بلکہ اپنی خواہشات کو کم کر کے ان کے نزدیک زندگی نفس کشی اور مسرت کا نام ہے اور سماجی معاملات چنداں اہم نہیں کسی شخص کا غلام یا مطلق العنان شہنشاہ جو ان کے لئے کچھ اہمیت نہ رکھتا تھا۔ یہ مسلک نہ تو انفرادیت پسند تھا نہ قوی اور نہ بین الاقوامی۔ بلکہ ایک صلح کل مذہب تھا۔ اسکے خیال کے مطابق تمام انسان ایک واحد اور ناقابل تقسیم اکائی ہیں۔ رواقی ایک آدمی کو شہروں کی مخلوق نہیں سمجھتا بلکہ ایک ہم نسل قوم کا رکن سمجھتا ہے۔ وہ مساوات کا قائل ہے اور مسرت کو صرف اسی وقت قدرتی سمجھتا ہے جب یہ عالمگیر ہو۔ جیسا کہ سلطنت روم کی آر زو تھی۔ اگر ریاست مجبورہ اور قطعہ واری ہو تو وہ ریاست اسکے نزدیک محض بنیادی اور رسمی ہے۔ وہ قانون قدرت کا قائل ہے جو مستقل اور اٹل ہے اور جس کے احکام مقام مذہبی نہیں

فوقیت کھتے ہیں۔ وہ انصاف کو قانون قدرت کا ایک حکم سمجھتے ہیں۔ اُس کی تعظیم کرتا ہے اور اُسے خارجی، دائمی، غیر متغیر اور عالمگیر سمجھتا ہے۔ اُس کے نزدیک مذہب کا مطلب نفسِ طامعہ کی اطاعت اور ہر اُس فرض کی کما آدا لگی ہے جسے ضمیر لانی قرار دیتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ قدرت اور قوانین قدرت کی نہیں نفسِ طامعہ ہی کا رفر ہے۔ دیوتاؤں کا وجود بایں وجود اسکے لئے کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔ اگر ان کا کوئی وجود نہیں ہے تو وہ ان کے بغیر بھی گزارہ کر سکتا ہے۔ اگر ان کا کوئی وجود ہے تو وہ جو سزا اُسے دین وہ بھگتے کیلئے تیار ہے۔

جن لاطینی روایوں نے سیاسی تحقیق و مطالعہ کیا ہے ان میں سینیکا (سنہ ۶۵ء) کو عظیم ترین اور ناقابلِ انکار حیثیت حاصل ہے۔ مشترکین کے کچھ اُس کا اور اسکے بعد آنے والے اہم رومی فقہاء کا جو تقریباً سب کے سب روایتی ہیں ذکر کریں ان دو مفکروں کے سیاسی نظریات کا مطالعہ لازمی ہے جو اُس سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ یعنی پولیسی (سنہ ۱۲۲-۱۰۷ ق م) اور سسرو (سنہ ۸۶-۷۹ ق م) مؤرخانہ کچھ حد تک روایتی فلسفے کے زیر اثر تھا۔

(۴) روماء کے سیاسی مفکرین

روما کا پہلا سیاسی مفکر پولیسی تھا اور لطف کی بات یہ ہے کہ وہ بھی یونانی تھا۔ وہ سول سال تک (۱۵۹-۱۶۷ ق م) روم میں ایک سیاسی جمعیتہ (ACHALAN LEAGUE) کے پرخال کے طور پر رہا۔ اس قیام کے دوران میں وہ رومی طرز حکومت کا مداح اور رومی عروج کا راز معلوم کرنے کا شوق ہو گیا (یہ یاد رہے کہ روم ایک زمانہ میں شہری ریاست تھی جسے ایجنٹر سپارٹا پر کچھ وقت حاصل تھی) کیونکہ اسکے عکس یونان کی شہری ریاستیں بہت بُری طرح ناکام ہو چکی تھیں۔ چنانچہ اس نے تاریخ روم کا غائرانہ و مفصل مطالعہ کیا۔ اسکے بعد اس نے ایک گراں بہا اور یادگار کتاب لکھی جس میں اُس نے کاڑھیں جنگوں کے آغاز سے لیکر اپنے زمانہ تک کے تقابلی طور پر بڑے ہوتے ہوئے رومی موصفت و اقتدار کے مختلف ادراج بیان کیے اپنی اس تاریخ کے ایک باب (کنشائش) میں اُس نے ان اصولوں کے فلسفیانہ تجربہ کی کوشش کی ہے جنہوں نے رومی آئین کو مدبرانہ طور

طریقہ پر مستحکم اور مضبوط کر دیا تھا۔ ارسطو نے ریاست کو بادشاہت، اشراقیت اور جمہوریت میں تقسیم کیا ہے۔ اس تقسیم سے پولیسی نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ان ہر قسم اسام کا اختلاف اندرونی اور اصولی نہیں بلکہ بیرونی اور ادارہ کا ہے اور یہ اختلاف متضاد قوتوں کی بنا پر ہے متضاد اصولوں کی بنا پر نہیں۔ وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ ان قوتوں میں سے کسی کی بھی اصلی حالت مستقل طور پر قائم نہیں رہتی وہ بدلتا رہتا ہے کہ یونان میں ریاست کی شکل و صورت میں ایک انقلابی تغیر و تبدل باقاعدگی اور تیز رفتاری کے ساتھ وقوع پذیر ہوتا رہا ہے۔ اس تغیر و تبدل نے مندرجہ ذیل دائرہ کی صورت اختیار کر لی ہے۔

بادشاہت - استبدادیت - اشراقیت - عد بدیت - جمہوریت اور حکومت انہو - اس کے بعد پھر بادشاہت وجود میں آئی ہے اور یہی دائرہ پھر تیار ہے۔

اس کے نزدیک رومی قوت دستِ کام کی وجہ یہ ہے کہ اس کے آئین میں ریاست کی قوتوں میں توازن کا ہر طور پر باہم مخلوط ہو گئی ہیں۔ فصل بادشاہت کے اصول کے منظر میں۔ ایوانِ اعلیٰ اشراقیت اور ایوانِ زیری جمہوریت کے اصولوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ آئینی نظام میں اس نے سب سے پہلے مزاحمت و توازن کا نظریہ پیش کیا۔ اسکے نزدیک ریاست ایک نامیاتی نظام (یعنی ریاست کسی جمعی حرکت کا نتیجہ نہیں بلکہ اس نے مختلف ذریعوں سے نشوونما پاتی ہے) نہیں ہے بلکہ ایک میکانیکی اختراع (یعنی ریاست محض طبعی حرکت کا نتیجہ ہے اور نیکی شوری ارادے کے خود بخود نمودار ہو گئی ہے) اور متضاد قوتوں کی ترتیب و انضباط ہے۔

پولیسیس روماء کے جس استحکام و توازن کا ثنا خواں تھا اس کی زندگی ہی میں اُس کی جگہ جھگڑوں اور ہنگاموں نے لے لی تھی۔ گراشی (سنہ ۱۳۳ ق م) کی شورشوں نے اشراقیت اور جمہوریت کے درمیان جس صمدال جنگ کا آفاک تھا اس کا نتیجہ جمہوریت کا زوال اور نشائش کا قیام ہوا۔ سسرو کی تصانیف پولیسیس سے ایک صدی بعد کی ہیں اس زمانہ میں جو لیس سیز راہنی فاتح فوج کی مدد سے روم میں ایک شہنشاہی آمریت قائم کر دیا تھا۔ سسرو ایک سرگرم جمہوریت پسند تھا اور سسرو

سے متفق و خائف تھا۔ وہ ایوانِ اعلیٰ کی عزت اور میسر پول کی قوت کے دوبارہ قیام کا خواہاں تھا۔ اسی کا نپوں "جمہوریت" اور "قوانین" میں اس نے ان دو بات کا جائزہ لیتے ہوئے پولیس کے خوش حال زمانہ کے بعد ہی سے جمہوریت کے المناک زوال کے لئے کوشاں ہو گئی تھیں۔ پولیس کو قانون کی مٹا دینا قرار دیتا ہے۔ اس نظر کے ماتحت سسر و نے یہ ثابت کیا ہے کہ اسکے وقت کی شورشیں درحقیقت اس جہ سے ہیں کہ جمہوری عنصر کو بہت زیادہ قوت دیدی گئی ہے۔ ایک ایسی قوت جس کا مارش اور سیر کے سے مقصدوں نے ناجائز فائدہ اٹھا لیا ہے۔ سسر و رومی جمہوریت اور اس کے آئین کی خوبیوں کی تعریف میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیتا ہے۔ علی مقاصد کیلئے وہ رومی قانون — جو انصاف و عدالت کے اصولوں کے لحاظ سے مضبوط ہے — کو روایتی قانون قدرت کے مترادف قرار دیتا ہے یہ امر واقع ہے کہ علم سیاست پر یہ اس کا اہم ترین احسان ہے، کیونکہ یہ نظریہ قانون قدرت کو آسمانوں پر سے زمین پر لے آتا ہے اور اس کے آزادی، مساوات اور اخوت کے اصولوں کو جی نوع انسان میں پھیلانے کا ذریعہ بنا کر دیتا ہے۔

۳۸ ایک ادنیٰ شخص کیلئے ایک ریاست کا بچانا ناممکن ہے چنانچہ سسر و نے سیرا دوا کے بھتیجے آفسطس کی مخالفت کر کے اپنے ہی قتل و بربادی کا سامان پیدا کیا۔ رومی جمہوریت کی جگہ ایک شہنشاہیت نے لے لی تھی۔ اسکے اولین اور بدترین بادشاہوں میں ایک نیر و نامی بھی ہوا ہے۔ آٹھ برس تک (۵۴-۶۲ ق م) اس کا اتالیق سینیکا اس کا وزیر بنا۔

نیر و کی وزارت کا عہدہ روایتی دہشتان (School Home) کے سخت ترین باند فلسفی کیلئے ایک سخت آزمائش تھی۔ تخیل اور حقیقت میں قیود المشرقین کی وجہ سے یک جہتی ناممکن تھی۔ ایک طرف تو روایتی فلسفہ کی تعلیم تھی کہ درجہ عالیہ کا غیر ترقی یافتہ اور جاہل انسان بھی معصوم اور مہر و تھا، اس دور میں قانون قدرت ہر شخص کی نگاہ میں پڑا ہوا تھا ہر شخص اسکی اطاعت کرتا تھا اور قانون قدرت — اس نے اس دور میں کافی مضبوط نظم قائم کر رکھا تھا، یہ شخصی ملکیت تھی، نہ غلامی اور نہ کوئی حکومت، بلکہ

آزادی، مساوات اور اخوت کا دور دورہ تھا۔ دوسری طرف نیر و کی شہنشاہیت تھی جس میں غیر معمولی بدعقلی، عظیم ترین جرائم، وسیع مصائب جبر و تشدد، عدم مساوات، کثیر ترین غلامی اور خوفناک عداوتیں خانہ جنگی کا باعث ہو رہی تھیں۔ اگرچہ یہ بادشاہت بُری تھی، مگر اس نے راجا ابراہیم سے اچھی تھی جو اس حکومت کے فائدہ پر یقینی تھی۔ اس لئے سینیکا اور اسکے سے دوسرے اشخاص اس شہنشاہیت کے حامی و معاون تھے انہیں اس امر کا احساس تھا کہ انہیں دو پڑا بیوں میں سے ایک بُرائی منتخب کرنا ہے۔ استبدادیت یا فوضویت (فوضویت کو مزاج بھی کہا جاتا ہے۔ اس نظام میں کوئی حکومت نہیں ہوتی اور ہر شخص اپنا خود اپنے لئے قانون ہوتا ہے۔ انارکزم اسی کا نام ہے)۔ اور وہ اول الذکر کو ترجیح دیتے تھے۔ کیونکہ استبدادیت میں ضبط و نظم قائم رکھا جاسکتا تھا اور یہ یا بیان کا مزاج سے کم جاہل تھی کہ زمانہ کے حالات قابو سے باہر ہو چکے تھے اور ان میں کسی قسم کی اصلاح کی امید نہ تھی۔ اس لئے اس روایتی (سینیکا) نے عزت نشینی اختیار کر لی اور دوسرے کا انتظار کرتے لگا کہ وہ اگر اسے ان جھیلوں سے خلاص کر لے یہ امر قابل ذکر ہے کہ روایتیوں کے نزدیک اس معیاری طرز حکومت میں جو دور جاہلیت میں قائم تھی اگر انسان اچھے بن جائیں تو یہ نظام حکومت دوبارہ بھی قائم ہو سکتا ہے (اور علمی طرز حکومت میں جو انسانی کمزوریوں اور غلطیوں کا لازمی نتیجہ ہے) جو اختلاف ہے وہ عیسائی اسقفوں کیلئے اس وقت بہت مفید ثابت ہوا۔ جب انہیں حکام اناجیل کو نئے عیسائی شدہ متذہب بزنطینی شہنشاہوں کے اعمال و افعال کے مطابق ڈھالنا پڑا۔

سینیکا کے ہم عصر فیقہوں اور اسکے بعد غلطین (۳۲۴-۳۶۰) کے زمانہ تک کے متعدد فیقہوں نے جو تقریباً سب کسب روایتی تھے — فلسفہ کے اصولوں کی قوانین پر غاند کیا۔ انہوں نے قانون قدرت کے روایتی نظریہ کو — یہ قانون قدرت دراصل تعلیم یافتہ خیر و عقل سلیم کے احکام پر مشتمل ہے۔ روم کے شہری قانون کو بلند و مظہر اور مین الاذہبی قانون جنگ کو دوسرے کرنے کیلئے استعمال کیا۔ قانون قدرت کے اصولوں نے غلامی کی تختیوں اور پابندیوں ہی تحفیف اور نرمی کر دی، عیساکر الہی بنے۔

سید مظفر برنی اردو شاعری کے سببانات

زمانہ اور ادب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ادب زمانہ سے متاثر ہوتا ہے اور زمانہ ادب سے اثر قبول کرتا ہے۔ ادب زمانہ کا اُمید ہے۔ تو زمانہ ادب کا پر تو ہوتا ہے۔ ادب زمانہ سے بے نیاز نہیں ہو سکتا اور زمانہ ادب کا دامن نہیں جھٹک سکتا۔ اسی لئے کسی زمانہ کے ادب کا جائزہ لینے کے لئے اس وقت کے مخصوص حالات اور رجحانات پر نظر غائر دلنا ضروری ہے۔

آج بیسویں صدی میں دوزیر دست رجحانات کو ارض پر چھا ہوئے ہیں۔ ایک اشتراکیت دوسرا جمہوریت۔ اولیٰ الذکر انیسویں صدی کے صنعتی دور اور اسکے نتیجے سرماہ دارانہ نظام کے رد عمل کا نتیجہ ہے اور مؤثر الذکر یعنی نوع انسان کے خواب آزادی کی بھم سی تعبیر ہے۔ ان دونوں رجحانات کا اثر عالمگیر ہے۔ اشتراکیت اور جمہوریت کی انتہا پسند صورت یہ ہے کہ یہ دونوں ”قدیم“ کے خلاف ”جدید“ کی حامی ہیں۔

گویا رجعت پسندی اور قدامت پرستی کی مکمل ضد ہیں۔ یہاں تک کہ ہر وہ اچھی یا بُری چیز جو کسی صورت سے بھی زمانہ ماضی سے منسوب ہے زمانہ حال کی ان تحریکوں کی زندگی میں آجاتی ہے۔ جنگ عظیم نے ان تحریکوں کو ایک نیا جوش، ایک نئی سرگرمی اور ایک نئی زندگی بخشی لیکن ہر تحریک ایک ایسے دور سے گزرتی ہے جب ترقی پسند قوتیں۔۔۔

(REVOLUTIONARY FORCES) رجعت پسند قوتوں

(REACTIONARY) سے برسرِ پیکار ہو جاتی ہیں۔ اور لطف یہ ہے

کہ دونوں ایک دوسرے کی ٹکرائی ہوئی ہیں۔ اس لئے جلد ایک دوسرے پر غالب نہیں آسکتیں۔ اس وقت یعنی نوع انسان ایک تذبذب کے عالم میں ہوتے ہیں۔ چونکہ کوئی فرق کامراں دکامباب نہیں ہوتا اس لئے وہ الگ پانی کی اسی مخالفت فرقیوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں وہ ایک ایسے دورا ہے پھر کھڑے ہوتے ہیں جہاں سے کبھی وہ مڑ کر اسی راستے کو دیکھتے ہیں جس سے یہاں تک آئے ہیں۔ اور کبھی ایک امید افزا شوقناک

ایک شوق افزا امید کے ساتھ نئے راستے پر نظر ڈالتے ہیں۔ یہاں سے نئے کی ہو ہو ایسی ہی کیفیت ہے۔ آمریت جو ملکیت کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے جمہوریت سے برسرِ پیکار ہے۔ سرمایہ داری اشتراکیت و کسٹ و گریماں کا ایک خام بے اطمینانی اور بے چینی کا عالم ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی بے تحاشہ دوڑتے ہوئے ٹھک گئی ہے۔ اور پھر کبھی حالت جمود سے اُٹتا کر دوڑنا شروع کر دیتی ہے۔ ایک ہجمن ایک اضطراب میں تماشہ دوڑنے پر کساتا ہے۔ لیکن پھر ایک قسم کی افسردگی اور دل برداشتگی ہمارے قدم پھلتی ہے۔ تاریکی دور ہوتی جاتی ہے۔ دور بہت دور اُتی ہو ایک نئی صبح کے آواز نمایاں ہیں۔ خدا جانے یہ صبح کدب ہے یا صبح صادق۔ آنکھوں پر سے غفلت کے پردے اُٹھتے جا رہے ہیں۔ اعتقاد عقل کے سامنے سر جھکا رہا ہے مسئلہ باتیں تنقید کی کوئی پوچھی جارہی ہیں۔ حتیٰ کہ خدا کا عدم یا وجود بھی معرض بحث میں پڑ گیا ہے۔ غرضیکہ یہ ”دوہلم شنگی“ (DISILLUSIONMENT) ہے۔

جب ہم اردو کی جدید شاعری پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا شعر و ادب بھی رفتارِ زمانہ کے ساتھ ساتھ چلنے کی کوشش کر رہا ہے اگرچہ کہیں کہیں اور کبھی کبھی اس دوڑ میں پیچھے رہ جاتا ہے۔ تمام جدید شاعری کا ماحصل یہ ہے کہ یہ زندگی اور فطرت سے قریب تر ہونی چاہی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ اردو شاعری الفاظ سے کھلتی تھی۔ پھر ایک ایسا زمانہ آیا کہ جذبات و احساسات سے بھی کھلتی لگی۔ لیکن اب زمانہ آگیا ہے کہ ہماری شاعری زندگی اور فطرت دونوں سے کھلتی ہے۔ زندگی اور فطرت جو خود ایک کھیل ہیں۔ پہلے شاعری زندگی کا ایک کھیل سمجھی جاتی تھی۔ اب زندگی شاعری کا کھیل بن گئی ہے۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں ہماری زندگی انفرادی تھی۔

لیکن بیسویں صدی میں ہماری زندگی انفرادی کی بجائے اجتماعی ہوئی

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ کی شاعری کا داخلی سبب (SUBJECTIVE)

خارجی پہلو (OBJECTIVE) پر غالب تھا اور جدید شاعری داخلی پہلو خارجی پہلو سے ہم آہنگ ہے۔ بلکہ جدید شاعری داخلیت اور خارجیت کا ایک حسین سنگم ہے۔ ہماری انفرادی زندگی صرف جذبات و احساسات کا نام ہے لیکن اجتماعی زندگی سیاست، اقتصادیات اور معاشرت وغیرہ سے عبارت ہے۔ اسی لئے آج حریم سخن میں سیاست، معاشرت، مذہب وغیرہ بھی بارباب ہیں۔

وقت کے ساتھ ساتھ ہمارے تصورات بھی بدل گئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہماری شاعری میں زندگی کے نئے تصورات، سیاست کے نئے عقیدے تمدن کے نئے مسائل، قوم و ملک کی ہمدردی کے نئے نظریے دعوتِ فکر دے رہے ہیں۔ میں اردو شاعری کے اس دور کو انقلابی دور کہوں گا۔ نہ صرف زبان و بیان بلکہ موضوعات و مضامین میں ایک زبردست انقلاب ہو گیا ہے ہماری شاعری پرانی نسیمِ فضا چھوڑ کر ایک نئی کھلی فضا میں سانس لے رہی ہے۔ غرض یہ ہے کہ شاعری کا نتیجہ بلکہ رہ گیا ہے۔ اس ڈرامائی تغیر و تبدل کا اندازہ مندرجہ ذیل شعروں سے ہوگا۔ غالب کا ایک شعر ہے ۵

نئے نیر کماں میں ہے نے صیاد کیں ہیں
گو شہ میں نفس کے مجھے آرام بہت ہے

یہ شعر صرف اس وقت کی عام ذہنیت کا آئینہ دار ہے بلکہ روحِ عصر کا بھی ترجمان ہے۔ آج زمانہ اور ماحول بدلنے سے ہی مضمون اس سانچہ میں ڈھل گیا ہے ۵

خطر پسند طبیعت کو سا زگار نہیں
وہ گلستاں کہ جہاں تاک میں بنو صیاد (انجمن)
زندگی کی مردانہ جدوجہد ہمارے زمانہ کا مسلک ہے۔ اس شعر سے نمایاں ہے۔ دیکھئے ہماری شاعری اجتماعی زندگی سے کتنی قریب پہنچی ہے اور زمانہ کے اثرات کہاں تک قبول کر رہی ہے ۵

بنالیتا ہے موجِ خونِ دل سے آشیانِ اپنا
وہ پاشیدہ نفس جو فطرتاً آزاد ہوتا ہے (اصغر گوندی)

لے اصغر صاحب جدید شاعر ہیں سے تو نہیں مپا۔ ۱۹۱۰ء صوفی شاعر ہیں اور قدیم و قیاسی متکونانہ خیالات ان کی شاعری کی جانب ہیں۔ ادارہ

وہی نفس وہی آشیان وہی سخن لیکن الفاظ کے اس روایتی ڈھانچے کے اندر آزادی کی وہ روح دوڑادی ہے کہ یہ شعر ہماری قومی ذہنیت کی صحیح اور سچی تصویر بن گیا ہے۔

جدید شاعری کا اولین جحان انقلاب کی جانب ہے۔ جنگِ عظیم کے بعد ہندوستان کے سیاسی مطلع پر کبھی دھواں دھار رہ چھا یا کبھی طوفانِ خیز آندھیاں چڑھیں کبھی جھکڑا آئے کبھی گولے اٹھے۔ غرض ایک عام بے حسینی اور حرکت و حرارت پیدا ہو گئی۔ روحِ بہور موجودہ سماج اور حکومت سے بیزار ہو گئی۔ انقلاب کی ایک لہر تمام ملک میں دوڑ گئی۔ اسی تغیر و تبدل کا اثر ہمارے شاعروں پر بھی پڑا ہے

جو ایک ایسا آئینہ میں شاہراہ وقت پر
چہرہ مہتی کے خال و خد ہیں جس میں جلوہ گر
اُڑ رہے ہیں جن کے پرچم آب و گل کے قعر پر
جن کی میناؤں نگیاں رہتی ہیں بغیر عصر پر (جوش ملیح آبادی)

ہمارے شاعر جو انک کو چہ بیکو اپنی دنیا سمجھتے تھے جو میناؤں کو جنت جانتے تھے جو 'جامِ آتشیں' کو حاصلِ کنین مانتے تھے۔ جو دربان کے قدموں میں سر بسجود رہنا عبادت خیال کرتے تھے۔ جو قتل کو تفریح کا گردانتے تھے۔ جو محبوب کے قصور سے سر اٹھانا گناہ خیال کرتے تھے جو حریمِ ناز میں باریابی کو معراج سمجھتے تھے۔ جن کی قیمتی زندگی کا مصروف صرف یہ تھا۔ ع

بیٹھے رہیں قصورِ جاناں کئے ہوئے
جن کے زمانہ میں کی حد یہ تھی کہ نازک اذامِ محبوب کے ہاتھ میں خنجرِ آبدار
و تیغِ جوہر دار دیکھا جانی سخت جانی اور ان ہتھیاروں کی 'سنو انیت'
کا مظاہرہ کریں و تیغ و کفن باندھنا صرف اس لئے ضروری خیال کرتے
تھے کہ۔ غدر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیکے گیا۔ جن کی آواز
زیر لب آہوں اور زبان دلسوز نالوں کیلئے وقف تھی۔ وہ بھی آج
زمانہ اور ماحول کے اثرات سے بے گناہ نہیں۔ وہ بھی موجودہ تمدن سے
بیزار ہیں۔ وہ بھی تہذیبِ حاضر سے متفرق ہیں۔ وہ بھی ظالم و جبار
حکومت کا تختہ الٹ دینے کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ وہ اس دنیا کو
نہایت ناوید و کر کے ایک نئی دنیا۔ ۱ نے خوابوں کی دنیا بنانا چاہتے
ایشا جون مولائی علی علیہ السلام

ہیں۔ وہ موجودہ فرسودہ نظام کو سمار کر کے اس کی بنیادوں پر ایک نیا نظام بنانے پر تلمے ہوئے ہیں۔ اب وہ فردوس گوش نہات کے متحمل نہیں۔ انہیں تلواروں کی جھنکاروں میں موسیقی کی لذت حاصل ہوتی ہے۔ اب طبل جنگ کی صدایں ان کی روضیں روض کر دے لگتی ہیں اب وہ قتل میں خونِ بھل کے روض کی دعوت تماشا نشین دیتے۔ بلکہ انقلاب کے وقت خون کی ندیاں بہانا چاہتے ہیں۔ اب ان کے لب لے نوازی میں مسمت نہیں بلکہ صوبھو کھنے کے لئے وقت ہے اب ان کی آنکھوں میں شراب کا خماریں بلکہ غصہ و غضب کے شعلے بک رہے ہیں۔ اب ان کی آواز روح انسانی میں انبساط کی لہریں دوڑاتی بلکہ اضطراب کے مد و جز پیدا کرتی ہے۔ سماج سے بغاوت، حکومت سے بغاوت، مسلمانوں سے بغاوت، موجودہ حالات سے بغاوت غرض بغاوت ان کی شاعری کا اور ہٹا بھونکا ہے۔ ہماری موجودہ شاعری کی تین انقلاب کی روح کا رہا ہے۔ ایک ایک شعر کسی نامعلوم جذبہ بغاوت، کسی مہم تائے تغیر، کسی اندوہی درد و کرب سے لکھا رہا ہے۔ آج ہر شاعر و شاعرین سے ہمراہ جنگ ہو کر یہ نعرہ لگا رہا ہے۔

کام بہ میرا تغیر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب (جوش)
علامہ اقبالؒ نے بھی جو قطعاً جدید شعرا (URTRA MODERN POETS) کے تحت منبر لے کر اس انقلاب کی کار فرما قوت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

خواجہ ازخونِ لگ مزدور ساز و لعل ناب
از جفا کے وہ خدا یوں کشت بہقا اٹھ اب

انقلاب

انقلاب اے انقلاب

جوش کی "بغاوت" "تمہار کی" "آوارہ"۔ علی سوار جوشی کی محال مستقبل۔ "تمہار ملیح آبادی کی" انقلاب کی "کار" "احسان کی" "باغی کتب" اولاسی قسم کی وہ سری نظیں ایک ناگزیر انقلاب کی خبر ہے رہی ہیں۔
مجاز کی نظم "آوارہ" کے چند جملے: "معلوم ہوتا ہے موجودہ

اصول سے نہیں وقت سے ہم آہنگ ہو کر۔

سماج کی بدعنوانیاں۔ سرمایہ داری کی سفالیاں، امراء کی عیاشیاں۔ غریب کی محبوریں شاعر کے دل و دماغ میں ایک طوفان بپا کر رہی ہیں۔ وہ سماج کی زنجیروں کو توڑنا چاہتا ہے وہ نام نہاد اخلاقی قوانین سے منہ موڑتا ہے کہ ان ہی کے پردے میں اخلاق سوز بدکاریاں روا رکھی جاتی ہیں۔ وہ حکومت کا تختہ الٹنا چاہتا ہے کہ یہی تمام برائیوں کی خڑ ہے۔

رات ہنس ہنس کے یہ کہتی ہے کہ میخانہ میں چل
پھر کسی شہ ناز لالہ مرغ کے کا شائے میں چل
یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست ویرانے میں چل
اے غم دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے ملا کا عمامہ جیسے شیشے کی کتاب
جیسے بیوہ کی جوانی بیفلس کا شباب
اے غم دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

لے کے ایک چنگیز کے ہاتھوں سے بھجوا دوں
تاج پر اس کے دکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی ٹرھ کر توڑ دوں
اے غم دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندر بھاگا ساز و سماں بھونک دوں
اس کا لکھن بھونک دوں اس کا شبنم بھونک دوں
تختِ سلطان کیا میں سارا قصر سلطان بھونک دوں

اے غم دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں
سماج سے بیزاری، حکومت سے نفرت، موجودہ حالات سے بے اطمینانی
کبھی بغاوت کا رجائی جذبہ اور کبھی روگردانی کا متشائم جذبہ پیدا کرتا ہے۔ جان نثارانتر حجاز کی طرح مقابلہ کی تاب نہیں لاتا۔ وہ اس کشمکش سے تنگ کر اس کو بھول جانا چاہتا ہے اور بے اختیار کہہ اُٹھتا ہے۔ ع دوست اسب کچھ بھول جائے دے مجھے
اس وقت فطرت کے روح پرور نظارے بھی جہنم و افسروں کی کے مرقع نظر آتے ہیں۔

پاتا ہے۔ وہ ایک ایسی دھن میں پسیدہ مجبوری غضبناکی سے ہم آغوش ہو جاتی ہے۔ کہہ سکتا ہے۔

پڑھیں جانے الٹی سیرِ دولت میں داغ بچھیں جاتے شربتِ انار کے چراغ اپنے تاجوں کی چمک سے تاجدار ہو شیار
نظم و بلاغت سے شعلہ خیز لکھنے کو رہا شمع و بناوٹوں میں لکھنے کو رہا
فرش گل والوں زمرہ بلوگ جو خواب میں خوں کے پاساؤں بکلیاں بیابان میں
یہ اس کی باطنی آواز ہے۔ یہ اس کا حکمِ یقین ہے۔ اس کی

مبصرانہ پیش گوئی ہے۔

جوش کی تضعیف۔ ”مید کا ہندوستان“۔ ”حسن اور خردوری۔
سازگی“ بھکاری۔ ”احسان کی بھیک“۔ ”مردورگی موت“ وغیرہ نظمیں
ہماری شاعری نے اس جدید میلان کی ترجمان ہیں۔ جوش کی نظم
”ملکِ تقابل“ کے چند شعر سنئے۔

مال کا وہ درجہ جس میں بل کے نزدیک آئے ٹھہر دوسرے درجے کے بالکل رستا
اس طرف سامانِ دل تنگی تھا چلے کا دھوا اس طرف جہوں پٹنی ٹھنڈی لگا کر خفا
اس طرف موجِ نفسِ ایک نالیہ تباہ تھی اس طرف تارِ سکونِ پڑھیں کی غراب تھی
آہ اُن لوگوں میں ایک شے شکر جو بھرتی تھی ان کے جوتوں پر چمک تھی جہوں پر تھی
آہ انشراحِ مدخلِ تناسیب کی کئی اس طرف بھی آہی تھی اس طرف بھی تھی
لیکن اس منزل سے بے نام گزرتا ہے کون جہذا اس ظلم کو برہنہ کر سکتا ہے کون
احسانِ مستقل طور پر شاعرِ مزدور کہلاتا ہے۔ اس کی شاعری کا

منہا ہی مزدوروں کی شرمناک عزت و یکسوی کی ہوا کا سی کرنا ہے۔ جوش کی
شاعری میں یہ جذبہ اس طرح محدود نہیں بلکہ عالمگیر و وسعت رکھتا ہے۔
”مظلوم بچہ“ بھی جو چمکا میدان میں تھا رُودے رہا ہے یکہ و تنہا
اس کے حیرت منجن میں بارِ باب ہے۔ وہ اسکی نفسیاتی عکسِ ریزی کیلئے وہ پہلو
منتخب کرتا ہے جو ہماری اوج میں تیرن کرنا چاہتا ہے۔

دادم جب گلگی سے گیند کی آواز آتی ہے
بچہ طفلی پر اک بچا رگی سی دوڑ جاتی ہے
وہ ”چادر کی بھیک“ کے بھی خفا سے طمس ہے۔

لفظ ہلکی سی اس ٹرینیا کو چادر

خدا یا! داورا! پروردگار!

اس کی تمام شاعری میں یہ جذبہ مختلف صورتوں میں نمایاں ہوتا ہے
ایک شب کا خاکہ لکھتا ہے۔ اس میں بھی خونِ افلاس سے رنگ بھرتا ہے
سوہے ہیں قی بھونکے پانچ دھڑکے مفلسی کی تلخ خزاؤں کو دامن میں لئے
بن گئی ہے سیدھی دھڑک بھلی سیاہ منموں کی چین چیشائی غریبوں کی نگاہ
موضوعاتِ نظم میں یہاں تک نوع پیدا ہو گیا ہے کہ ہمارا شاعر
صرف حسن و دلکشی کا چوہا نہیں۔ اسکی نظریں حیات کے صرف خوبصورت
پیلوڈ پر نہیں پڑیں۔ بلکہ وہ بد صورتی میں بھی حُسن دیکھ لیتا ہے۔ وہ صحرا
میں بھی خلعتاں ڈھونڈ نکالتا ہے۔ وہ صرف شیریں و لہجہ کے حُسن کی گیت
نہیں گاتا۔ بلکہ مہترانی کو بھی دیکھ کر لڑا اُبالا ناز انداز سے لایا ہے گلتا ہے۔

مہترانی جو کہ رانی لنگٹا لنگٹا کے ضرور

کچھ بھی ہو جائے جو لائی لنگٹا کے کی ضرور (جوش)

ہر وہ چیز جو اس کے جذبات کو گدگداتی ہے اور اس کے احساس کو
اکساتی ہے۔ مختار نظم میں کہتی ہے وہ ”لوٹی ہوئی بوتل“ سی حیرت سے
بھی جو عام طور سے نظر انداز کر دی جاتی ہے شاعر چاہتا ہے کہ کہتا ہے

ع السلام لے جنت بے صبح کو شرا سلام

تجارتی ”رل گاٹی“۔ ”آخر بریلوی کی ”ٹھیل“ وغیرہ نظمیں اس نے ۳۳
میلان کی علامتوں کی شاہد ہیں۔

وہ رِ حاضر کی شاعری میں بے باکی (جو بعض دفعہ عیانی کی حد تک پہنچ
جاتی ہے) نہایت درجہ نمایاں ہے۔ اب جذبات کا گلا نہیں گھونٹا جاتا۔
احساسات پر پردے نہیں ڈالے جاتے۔ عشق و محبت کا اظہار
استعاروں میں نہیں کیا جاتا۔ مذکر ضمائر کے استعمال اور طرزِ ادا کے
بیچ و خم سے صداقتِ احساس اور صاف بیان کا خون نہیں کیا جاتا۔
عہدِ حاضر کا شاعر صرف بالواسطہ مخاطب پر عمل پیرا نہیں
بلکہ زبان و بیان میں اس حد تک تبدیلی کر دی ہے۔ کہ ضمائر کے تباہی
استعمال کے علاوہ خودیہ کا قیو یا اصلی نام بھی پیش کرتے ہیں جھپکا
ایامِ جاہلیت میں جبکہ عربوں کی شاعری معراجِ کمال پر تھی عرب شعراء اپنی
محبوبہ کو نامِ تمام مخاطب کرتے تھے۔ اور یہی عین فطرت تھا۔

آخر شمرانی کی ”سلمی“ اور ”ریحانیہ“ جاں نثارِ اختر کی ”انجم“ ان کی
شاعری کی منتہا ہیں نتیجہ یہ ہے کہ جذباتِ فطری احساساتِ شدید اور

ایسا خون جگرانی ۱۳۵۰ء

ل۔ احمد صاحب اکبر آبادی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ ”میں سمجھتا ہوں
اُردو زبان کی اصلی صورت ان بدوں میں جھلکتی ہے اور اس وقت جو
رجحان نظر آ رہا ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے کما جاسکتا ہے کہ پچاس برس
گزرنے سے پہلے ہی زبان مقبول عام ہوگی“ اس باب میں سائنس
کی ان تھک کوششیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس کی مشہور نظم
”دناگ“ کا ایک بند سنئے۔

سینہ تانے یمن پھیلائے مجھ کو رہے ہو ایسے
جیسے کوئی کنی کنواری دھڑلانی کر چھوئے
اندھادی وہیں ہے تھکرا نورنسا را ہالا
رات کی دیوی کیا جھلک رہی ہو گئی ہے ہالا

ٹھہر اک تصویر بانوں اے بانہ کے داسی
آؤ تہیں تن میں میں بسا لوں آ بانہ کے داسی
وہ الفاظ و محاورات جو اب تک حریم سخن میں باریاب تھے۔ اس عالم ہندی
(عوام ہندی نہیں) کے دور میں مختلف طریقوں سے روشناس کئے جا رہے
ہیں۔ متحرک لیکن جامع الفاظ نئے دور کی کمال میں پسندیدگی کا ٹھپہ لگا کر
راج کئے جا رہے ہیں۔ غرض یہ ہے کہ جمہوریت کی روح الفاظ و محاورات
میں سرایت کر گئی ہے۔ کوشش یہ کہ جاتی ہے کہ جمہور انہیں سمجھ سکے۔ اور
اومان سے حظ و نشاط حاصل کر سکے۔ آج کل ہر شاعر کا مطمح نظر یہی ہے کہ
زبان نایسی ہو جسے ہر خاص عام سمجھ سکے۔ اور بڑا زادانہایت صاف روشن
سیدھا سادھا اور مؤثر ہو۔ استعاروں کی پیچیدگی انشپوں کی کھینچ تان
تلمیحات کے بہرہ پر اب محاسن شعری میں داخل نہیں۔ اب وہ استعارات اور
تشبیہات عام مشابہے سے اخذ کی جاتی ہیں۔ مثلاً

مُہر یوں سے کھر مدہا پن چہرہ بے آب میں
جیسے کھل جاتی ہیں در زیں سوکھ کر تالاب میں (لہسان)
سبزے کے دامن پر یوں کندلی مارے بیٹھے
جیسے محل انکھ سے ہر کر نزار اور کھیرے (سافر)

حضرت تانہ بلکہ تیرنے سے جس طرح کاٹی ہو پٹا چلا جاتا ہے خط بگڑا
لہ ہر شاعر کا نہیں کہ نظم و شعر کی الفاظ نگاری کا سرمایہ اتنا سخت ہے کہ اسے عوام
تو عوام وہ لوگ سمجھ ہی نہیں سکتے ہر شاعری سے نمایاں ذوق نہیں کئے۔ (ادارہ)

طرز بیان حد درجہ مخلص ہو گیا۔ علاوہ انہی ان کی شاعری میں کردار
کی استوار ہی بھی پیدا ہو گئی ہے۔ چونکہ ایک ہی محبوب بہتی نظم میں جلوہ گر
ہوتی ہے۔ اس لئے جذبات میں باطنی ہم آہنگی۔ اخلاقی ہندی اور روحانی
یگانگت کا یہ تو نظر آتا ہے۔ حقیقت پرستی کے اس دور میں محبوب کی بہتی
فرضی یا تخلیقی نہیں رہ سکتی کسی خیالی پیکر میں مستعار جذبات اور صنفی الفاظ
کی سیجافسی سے جان نہیں ڈالی جاسکتی۔ اب تو مجبورہ ایک جیتی جاتی
انسانی ہستی ہوتی چاہئے۔ جس کے کردار کا خاکہ قارئین کے ذہن پر ترسیم
ہو جائے یہی وہ ہے کہ ”سلا“ یا ”دائم“ کو گشت پرست کی ہستیاں ہونے
کے باعث ہم سے نہایت قریب نظر آتی ہیں۔ اس قسم کی شاعری میں نزاکت
احساس اور سخن اداسے جان پڑ جاتی ہے۔

قدیم تہذیب کا تقاضہ تھا۔ کہ صفت { SEX } کی دیواری
آہنی ہوں۔ لیکن ہمدعا صفت صنف نازک صنف کرخت کے دوش بدو
ہے۔ قدامت پرستی جنسی جذبے کو اب گناہ گرد دانتی ہے۔ لیکن آج مسیحا
صدی میں یہ جذبہ دوسرے جذباتوں کی طرح طبعی خیال کیا جاتا ہے۔ علاوہ
انہی پر رجحان ہماری صحت مندانہ نفس پرستی کا بھی شاہد ہے اور ”مذاق
عجمی“ کے رد عمل کا نتیجہ ہے۔ فرائیڈ کے نفسیاتی تجزیہ اور psycho-
complex کے نظریے سے ہمیں اس قابل بنادیا ہے۔ کہ ہم اپنے
کو جنوی عکس پیکر سکیں۔ ہماری تمام روانی شاعری جذبہ جنسی کے تحت
گھوم رہی ہے۔

جدید شاعروں کا پہلا مسلک وسعت زبان ہے۔ فارسی اور
عربی کے مستعمل الفاظ کے علاوہ بھاشا کے میٹھے میٹھے شبد بھی گھلا ملا کر
استعمال کئے جا رہے ہیں۔ جوش کی نظم ”یہ کون اٹھا ہے ٹھراتا“ سے
چند بند پیش کئے جاتے ہیں۔

نچ پر شمرنی آنکھ میں جادو بھینی بھینی بریں خوشبو
بانگی چتون سٹے ابرو نیچی نظریں بھرے کیسو
یہ کون اٹھا ہے ٹھراتا

نہیند کی لہریں گنگا جمنی جلد کے نیچے ہلکی ہلکی
آنچل دھلا مکس ساری ہلکی ہندی دھندلی ہندی
یہ کون اٹھا ہے ٹھراتا

حافظ پر یونسی ایک مبدار کن گہری خراشیں

ڈال دیتی ہے شبِ غم میں پیسے کی پکار (جوش)

میٹھی ساہی مادی نشیہوں سے ہم نفسی کیفیتوں کی عکاسی کی جاتی ہے
آئی جوان کی یاد تو آتی چلی گئی ہر نقشِ سوا کو مشائی چلی گئی
ویرانہ حیات کے ایک ایک شے جو کن کوئی ستارہ سجاتی چلی گئی

(جگر)

کسی لکڑی تشبیہوں کے تصور سے محبوب کی رفتار کی تصویر کھینچ گئی ہے
کوئی خوابوں سے بنی ہوئی شے ہے گویا جامِ سرشار سے چھلکی ہوئی ہے گویا
بھری برسات کی راتوں میں جب گائے تھی ہری رفتار اسی گیت کی لے ہے گویا

(اختر انصاری)

جدید شاعر جو بحر و لا زبان کے استعمال میں بھی بڑی حرکت آزاد
خود پسند واقع ہوا ہے۔ حقیقتاً جالندھری کی نظم ”ابھی تو میں جوان ہوں“

کا ایک اقتباس پیش ہے۔ یہ نظم کسی مقررہ صنفِ سخن کے تحت میں نہیں آتی

عباد توں کا ذکر ہے نجات کی بھی منکر ہے

نیال ہے عذاب کا جنوں سے تو اس کا

گر سنو تو شج جی عجیب شے ہیں آپ بھی

بھلا شباب و عاشقی الگ ہوئے یہی ہیں بھی

حسین جلوہ ریز ہوں ادائیں فرستہ خیز ہوں

جو ایں عطر میز ہوں تو شوق کیوں نہ تیز ہوں

نگار ہائے فتنہ گر کوئی ادھر کوئی اُدھر

اُبھارتے ہوں عیش پر تو کب کرے کوئی بشر

چلو جی قصہ مختصر تمہارا نقطہ نظر

درست ہو تو جو مگر

ابھی تو میں جوان ہوں

بحر و اوزان کے انتخاب میں زیادہ تر ذوقِ تنقید کو سہم سنا یا

جاتا ہے۔ توانی و ردیف کی بے جا پابندیوں کے خلاف یہاں تک علم

بغاوت بلند کیا گیا ہے کہ ردیفِ قافیہ اور بحر سے آزاد نظمیں کا رواج

چلا ہے۔ ”میراجی“ خالد، ن۔ م راشد، فیض احمد فیض اسی رنگ

راج کر نے میں پیش پیش ہیں۔ یہ صرف جذبات کی ادائیگی اور نفسی لہروں

کی (PSYCHIC WAVES) عکاسی پر زور دیتے ہیں۔ ن۔ م راشد

کی ایک نظم ”خوکشی“ کا ایک بندہ سنے

کر چکا ہوں آج غمِ آخر میں

میرا غمِ آخری یہ ہے کہ میں

کو دباؤں ساتوں منزل سے آت

آج میں نے پایا ہے زندگی کو بے نقاب

آتا جاتا ہوں بڑی مدت سے میں

ایک منوہ ساز و ہرزہ کا رعبہ کہ پاس

اس کے تحت خواب کے نیچے مگر

آج میں نے دیکھ پایا ہے لہو

تازہ و درخشاں لہو

گیت اور دوہے بھی مقبول ہو رہے ہیں۔ گیت ہندوستان کی

روحِ شعری پہلی انگریزی ہے۔ یہ عوام الناس کی زندگی کا جزو لا ینفک ہے

ہر ملک میں (FOLK SONGS) مقبول رہے ہیں۔ اب کہیں جا کر

ہمارے شاعروں نے بھی اپنی توجہ اس طرف مبذول کی ہے۔ ساغر انور غلط

کے گیت خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ حقیقتاً الفاظ کی موسیقی کا زیادہ خیال

کرتا ہے اور ساغر الفاظ کی موسیقی کے ساتھ روح کی موسیقی بھی پیدا کر دیتا

ہے۔ حقیقت کے گیتوں میں کہیں کی بند و فصاحت پائی جاتی ہے۔ اس کے

برعکس ساغر پیغم کے گیت ادا جاتا ہے۔ ان میں بند و فصاحت کے پھیلنے کے

برخلاف کنواری کنیا کی کسی چمک اور جھجک نظر آتی ہے۔

بیسویں صدی کا انسان اپنے اباؤ اجداد کی نسبت زیادہ مصروف اور

کثیر الشغل ہے۔ اس کی زندگی ایک بے تماشہ دوڑ کے شاہ ہے جس میں آگے

بڑھنے کے دم لیکر کسی کوئی کنجاش نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقت کی رفتار

بڑھتی جا رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یوں ہی بہت سی ایسی تحریکیں آئے ان

وجود میں آتی رہتی ہیں جن کا منشا وقت کی بڑھتی ہوئی رفتار اور زندگی کی غیر

فطری سرعت کا انسداد کرنا ہے ادبی نوع انسان کے لئے آرام اور فرصت

کا وقت نکالنا ہے۔ فرصت کے لمحات کے اختصار کا ادب پر یہ اثر پڑا

کہ آج مختصر افسانے، ایک ایکٹ کی تمثیل اور مجموعی ٹیوٹیں رائج

ہو رہی ہیں۔ اردو اس سے مستثنیٰ نہیں۔ ”سحر البیاض“ کی سی شیطان کی کائنات

آہستہ آہستہ ناپید ہیں۔ یہ بھی کسی قدر بُرائے زمانے کا قصہ ہے۔ لیکن جدید
 اوجھن جدید ادب میں بھی نہیں اور آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ ”آج شمع اٹھو“
 کی سی طویل نظریں بھی مفقود ہیں۔ نظموں کے اختصار کی حد یہ ہے۔ کہ اب قطعہ
 اور رباعیات قبولیت عامہ حاصل کر رہی ہیں۔ نہ صرف اصناف سخن کی طوالت
 اختصار میں تبدیل ہو رہی ہے بلکہ نفس مضمون بھی اس سے متاثر ہو رہا ہے
 ہمارے زمانہ کا انسان ایک وقت میں ایک ہی کام کر سکتا ہے۔ ایک ہی بات
 سوچ سکتا ہے۔ اور ایک ہی بات قبول کر سکتا ہے۔ اس لئے تمام مثنوی
 سخن میں وحدت تاثر اساسی حیثیت رکھتا ہے حتیٰ کہ غزل بھی جو گو ناگوں
 احساسات اور بوقلمون جذبات بلکہ بعض دفعہ متضاد جذبات کا آئینہ ہوتی
 تھی جس کا ایک شعر وصل کی لذت دوسرا شعر جبر کی اذیت تیسرا محبوب کے
 تقاضا چاہتے اس کے التفات بے پایاں کا ترجمان ہوتا تھا۔ آج وحدت
 تاثر پر مبنی ہے۔ مسلسل غزلوں کو چھوڑ کر عام غزلوں کی تہیں بھی ایک ہی تاثر
 ایک ہی جذبہ ایک ہی نفسی رد و کار فرما نظر آتی ہے مثلاً جگر کی ایک غزل ہے
 بیتاب ہے بختاب ہے معلوم نہیں کیوں؟ دل ہی ہے آہ بیتاب معلوم نہیں کیوں؟
 بے کیف ہے تاب ہے معلوم نہیں کیوں؟ پھیل گیا شب مہتاب ہے معلوم نہیں کیوں؟
 بے نام ہی ایک یاد ہے کیا جانے کس کی؟ بوجہ تہ تاب ہے معلوم نہیں کیوں؟
 دل آج بھی سینے میں مٹھ کر رکھا ہے لیکن کتنی ہی آہ بیتاب معلوم نہیں کیوں؟
 دیکھا تھا کبھی خواب معلوم نہیں کیا ابنگ اثر خواب ہے معلوم نہیں کیوں؟
 معلوم نہیں ہوتا ہے کہ ہر تازہ تھیر میرے لئے بیتاب ہے معلوم نہیں کیوں؟
 قطعات بہم جذبات اور دھندلے احساسات کے اچھوٹے مرقعہ ہر کثر
 قطعات ایک نظم کی ہی جامعیت لکھتے ہیں۔ علاوہ انہیں ہمارے احساسات
 اس درجہ نازک اور ہمارے جذبات اس حد تک ذکی المحس ہو گئے ہیں کہ
 تفصیل کی بجائے اختصار اور صریح بیان کی بجائے کن کنوں سے کام لیا جاسکتا
 ہے اسی لئے ہم نے قطعات میں اشاروں اور کنوں سے وہ بات کر دی جاتی
 ہے کہ شاعر کے نفس بیان اور سخن احساس سے کیف و سرور کی ایک موج
 دل و دماغ کو چھو کر کل جاتی ہے۔
 جو کوئی پوچھتا ہے شاعر کیوں یہی آگے نکلیں لے کہیں کتابوں آج سو نہ سکا
 ہزار چاقوں گریز نہ دیکھوں گا کبھی کہ رات رونے کی خواہش تھی اور رونے کا

(اختر انصاری)

ایضاً جون جولائی ۱۹۳۲ء

انسانی نفسیات اور جذبات صدیوں سے شعر کا جامہ پہنتے رہے ہیں لیکن آج
 بھی انہی احساسات اور جذبات پر ایسے مختلف زاویوں سے روشنی ڈالتے
 ہیں کہ ایک نیا لطف، ایک نیا عروسِ حظ حاصل ہوتا ہے۔

دور حاضر کا ہر شاعر اپنا کلام ترنم سے پڑھتا ہے۔ ریڈیو کے شاعروں
 نے قارئین کے ساتھ سامعین کا حلقہ وسیع سے وسیع ترک کر دیا ہے۔ اس کا
 کلام پر یہ اثر پڑا کہ ہر شاعر ایسے الفاظ اور ترکیب انتخاب کرتا ہے جو دل
 قبل کر ایک نوع کی روانی اور ایک قسم کی موسیقی پیدا کر دیتی ہیں۔ وہ ترنم الفاظ
 موسیقیت نواز ترکیب، متوازن کلمات استعمال کر کے محسوس ہوتا ہے کہ ایک ایسا
 آہنگ پیدا کر دیتا ہے کہ غزل بالظن سے جیتے ہوئے دنیا کی سی روانی اور
 ستاروں کی کسی راگنی سے مملو نظر آتی ہے۔ گو با شاعری ”غنائت“ سے قریب
 ہو گئی ہے۔ بھاشاکے الفاظ کی کثرت استعمال اور گیتوں کی مقبولیت سے
 خیال ہوتا ہے کہ وہ زمانہ دور نہیں جب ہر نظم بجائے خود ایک نغمہ ہوگی۔
 نغمہ بھی شاعری طرح اظہار جذبات کا ایک ذریعہ ہے۔ جذبات کے مرقعہ کے ساتھ
 نغمات بھی متنوع ہوتے ہیں۔ ”نغمہ شادی“ سے مختلف ہوتا ہے
 رجز اور سادوں کے گیتوں میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ میدان کا راز
 کی موسیقی اور شہستان کی موسیقی میں تین امتیاز پایا جاتا ہے۔ شاعری اور
 موسیقی تو اہم فنون لطیفہ ہیں۔ اکثر شاعری موسیقی اور موسیقی شاعری بن
 جاتی ہے۔ جدید شاعری بھی موسیقی سے ہم آغوش ہوتی جا رہی ہے۔ آج
 شاعر کے خلوص بیان کی حدود و فطرت کی حدود سے طبعی جاری ہیں۔ اسی
 لئے اسکے جذبات نغمات کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ ”یوں کون اٹھا
 ہے شرماتا“ کی موسیقی اور ”بغاوت“ کا رجز نفس مضمون سے ہم آہنگ ہے۔

ہماری جدید شاعری کا ایک رجحان فطرت پرستی کی طرف بھی ہے۔ گراہی
 پرستار فطرت و رد و ردھن کی نظریں مفقود ہیں۔ اردو کی اس ہیئتِ ادبانی کا
 ماتم کرنے والے صاحبِ تاریخ ادب اردو اس طرح رنظر آ رہے ہیں۔ ”دوہائی
 اور قدرتی مناظر کے لحاظ سے اردو شاعری کا دائرہ محدود ہے۔ قدرتی
 مناظر جو شعرائے مغرب کے دلوں میں عجب عجب انگلیں پیدا کرتے ہیں
 ہمارے اردو شاعروں پر وہ اثر نہیں کرتے۔ مولانا اباس برہنہ مناظر
 قدرت کی تمجید میں لکھتے ہیں۔ قدرت کو لیجئے اسکے جتنا رجا بابت آٹھ

کے سامنے ہیں۔ لیکن ہمارے شعرا نے کہیں اب جا کر نقاشی شروع کی ہے اور ابھی وہ زمانہ دور ہے کہ نیچر کی تصاویر منٹھے سے بولنے لگیں۔ فطرت کی تصاویر اکثر نظموں کے پس منظر کے طور پر تو پیش کر دی جاتی ہیں۔ لیکن بعض فطرت کی برساتی بالذات مقصود نہیں۔ جوش نے اکثر نظمیں فطرت کے معصوم مناظر سے متاثر ہو کر لکھی ہیں۔ لیکن جوش میں دروازہ در بھٹکی سی والہانہ شیفنگی اور روحانیت کا بر لو نظر نہیں آتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جوش فطرت سے مانوس نہیں۔ وہ صرف فطرت کا تماشا ہی ہے متناثر نہیں۔ وہ فطرت کے مناظر میں کہیں جاتا۔ بلکہ بیدار احساس اور بینا آنکھ سے اس کے شے کا جائزہ لیتا ہے۔

خامشی دشت پر جس وقت کہ چھا جاتی ہے

عمر بھر جو نہ مٹی ہو وہ صدا آتی ہے
دشت نہ رکھ دیتا ہے گہرا کے رگ جاں پہ کوئی

جب کلی خاک پہ دم توڑے گر جاتی ہے
مسکراتی ہے چورہ رہ کے گھا میں بجلی

آنکھ سی کوہ و بیاباں کو جھپک جاتی ہے
بھار ڈیوں کو جو ہلا تے ہیں ہوا کے جھوکے

دل شبنم کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے
مجھ سے کرتے ہیں گھٹنے باغ کے سائے باتیں

ایسی باتیں کہ مری جان پہ پن جاتی ہے
جب ہری دوب کے ٹڑجاتے ہیں نازک لیشے

شیشہ قلب میں ایک ٹھیس سی لگ جاتی ہے
ان مناظر کو میں بے جاں سمجھ لوں کیونکر

جوش کچھ عقل میں یہ بات نہیں آتی ہے
(ار "ذی حیات مناظر" بہ تصوف)

قلب صحرا میں جھپٹے کے بونٹ دل میں غمطاس ہے ایک طرف انگ
مجھ سے کتا ہے کیا خدا جانے دھماں کے کھیت پر شفق کا رنگ

اس کا عقیدہ ہے۔۔۔
ہم ایسے اہل نظر کو شہت حق کیلئے اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کا مٹی

اس باب میں جوش بخودی مردم کی اصلاح کے طاقی رہے۔۔۔
ایشی جون جولائی ۱۹۴۷ء

کملانے کا مٹی ہے اسکی اکثر نظمیں مثلاً "شام کا رومان" ہمارا ایک دوپہر "روح شام" "جذبات فطرت" وغیرہ ہمدی شانی شاعری کی غنیمت بنی رہیں گی۔ عام مردم سے ہٹ کر ایک نئی ڈگر نکالنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آئندہ آنے والے شاعر اس راہ پر گامزن ہونگے۔ جو کم ہے ہماری شاعری کی ایک شاہ راہ بن جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے شاعروں کو دنیا کے تلخ حقائق کی جہل جلائی دھوپ سے فطرت کے سکون پرور سائے میں دم لینے کی فرصت ہی نہیں اور یہی ان کیلئے اچھا بھی ہے۔ زمانہ آئینا کہ وہ فطرت کے آغوش میں سکون کے تلاشی ہونگے۔

آج دنیا ایک عجب بد نظمی، انتشار، ابتری اور بھل کے بھور میں
بھنسی ہوئی ہے۔ سماجی افراتفری اور دماغی اھلاس کے باعث مذہب

جو سکون اور شانتی کا پیغام تھا۔ یس پست ڈال دیا گیا۔ آج تنقید کا دور
دورہ ہے۔ تلقین کو کوئی نہیں پوچھتا۔ اعتقاد کی جڑیں تشکیک نے ہلا کر

رکھ دی ہیں۔ سائنس کی دن دوئی اور رات چوگنی ترقی نے سونے پہرے
کا کام کیا۔ غرض اس دور عقلیت میں تصوف اور روحانیت کی دال

نہیں گل سکتی۔ مذہب کا سکھ نہیں چل سکتا۔ مٹی کے جو خداوندی بھی
معروض شک میں پڑ گیا ہے۔ ہندوستان میں دھرمیت ایک اور وجہ سے بھی

فرسوخ پارہی ہے۔ قاعدہ ہے کہ جب مظلوم و مجبور انسانوں پر اس
حد تک ظلم و ستم روا کر کے جاتے ہیں۔ کہ وہ دبے سانپ کی طرح کانٹے کو

دبڑے نہیں۔ تو ایسی حالت میں وہ ہر ظلم و جابر ہستی سے باغی ہو جاتے
ہیں خواہ وہ انسانی ہو یا باوق الا انسانی۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے

اکثر شاعر اشتراکیت کے زیر اثر تصوف، روحانیت اور مذہب سے
مخوف ہونے کے بعد خدا سے بھی باغی ہو گئے ہیں۔ وہ کسی ایسے

"شخصی" خدا کے قائل نہیں جو تبار و جابر ہو۔
اللہ کو تبار بتانے والا۔ اللہ تو رحمت کے سوا کچھ بھی نہیں

وہ سماج کے عیاجبندھنوں تقسیم دولت کی بدعنوانیوں، سیاسی عیاریوں
اور شیطانی بدکاریوں کو آسمانی خدا نہیں، ارضی انسانی جابروں سے

منسوب کرتے ہیں اور بعض دفعہ اس روح فرسا کشمکش سے مجبور ہو کر
کہہ اٹھتا ہے۔۔۔

تیرا اک بندہ مجھ کو روتا ہے لے خدا مر گیا کہ سوتا ہے (جاذب شہت)
ایشی جون جولائی ۱۹۴۷ء

وہ ایک ایسے خدا کو تصور دیتے ہیں کہ
 ”جس کے ہفتے میں زمانہ ہے جس کے قدموں پر تیریں“
 آج تک پہنچی نہیں میں اوج تک چشم خیال
 ایک نامعلوم قوت ایک نا دیدہ جلال
 ”دایخ شخصیت“ سے ہے نا آشنا جس کی نہیں
 نفع انسان کے تعاون کی جسے حاجت نہیں
 جس کا ہر تارہ ہے مصحف جہاں ہر ذرہ کتاب
 جس کے دفتر کی ہے زیریں ہر قرص آفتاب
 وہ خدا وہ طاقت مطلق وہ دارائے حیات
 جس کی ایک دنی سی جنبش کا لقب ہے کائنات
 علاوہ انہی دنیا کو رنگ و نسل کے استیازات، صنعت و تجارت
 کی مقابلہ بازی، کمزور اقوام کی پائمالی اور آئے دن کی خونریزیوں سے
 نجات دلانے کی اس صرف بین الاقوامیت سے بڑھتی ہے۔ ہمارا شاعر
 بھی بائی مذہب سے کنارہ کش ہو کر صرف بین الاقوامیت کو اپنا مذہب اپنا
 دین، اپنا ایمان قرار دیتا ہے۔
 اٹھ کھڑے ہو اور یکجہل عادت کے لئے اک نیا نقشہ بنائیں آدمیت کیلئے
 آدمیت میں جلاوطن بھی بھڑکنا فراغ
 اور کچھ حاجت نہیں ہے دو کی کھوپڑی
 آدمی ہوتا ہے کافی آدمی کو اسطے
 آدمیت دین ہو انسانیت ایمان ہو
 (جوشش)

بغی شاعر اور ناگ میں ایک اور بھی مماثلت ہے۔ کہ شاعر تخریب
 کا حامی ہے۔ تخریب کی تصویر ناگ کے نزدیک نہیں ہوتی۔ وہ بھی فطرت
 کی تخریبی طاقتوں میں سے ایک طاقت ہے۔ شاعر ناگ بن کر سرمایہ داروں
 اور اجارہ داروں کو ڈس میںستا چاہتا ہے۔ وہ ناگ کا مقابلہ اور دوسرے
 ہزاروں انسانی ناگوں سے کرتا ہے اور آخری نتیجہ نکالتا ہے۔
 بس ہے تمہارا بوند برابر ان کا زہر مند
 ڈنک تمہارا ویرانوں تک ان کا دستا گھر
 تیرا کاٹا اک دن زندہ ان کا کاٹا پیل بھر

سحر تمہارا سر پر بولے ان کا جلدہ پونہ
 دل سے ان کا زہر مٹا لو لے بائی کے باسی
 آدمیتیں تن میں بسا لوں اسے بائی کے باسی
 یہ نظم صرف انقلاب کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے بلکہ اس میں ہماری جہت
 شاعری کی دوسری خصوصیات بھی نظر آتی ہیں۔ اس کی زبان عام فہم
 الفاظ سیدھے اور شیریں ہیں۔ یہ اردو ہندی ملاپ کا بہترین نمونہ ہے۔
 اس میں بہتے ہوئے پانی کی کسی روانی اور موسیقی پائی جاتی ہے پیشہ بہات
 عام مشاہدے سے اخذ ہیں اور ایک ندرت اور جدت لئے ہوئے۔

ہملہ سے ملک کی موجودہ تباہ ناگ حالت سماجی افراتفری، دہائی
 افلاس اور روحانی ہمو کا تقاضا تھا کہ ہملہ سے ادبی فنونیت کی نوع
 سراپت کر جائے لیکن اسکے برخلاف ہماری شاعری رجائیت کے جذبے
 سے مملو نظر آتی ہے۔ یہ ایک نیک شگون ہے۔ لیکن یہ اس بات کا بھی ثبوت
 ہے کہ ہماری فنونیت حد کو پہنچ چکی تھی۔ چونکہ فنونیت کی تیرہ شاخیں ہی
 رجائیت کی صیغہ تباہ ناگ کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ مزید براں ہماری شاعری
 جو محض حسن و عشق اور شراب و کباب کا مجموعہ کی جاتی ہے۔ ملک و قوم
 میں ایک ذہنی انقلاب پیدا کرنے میں مدد و معاون ثابت ہو رہی ہے
 ادھر سیاسی و سماجی انقلاب کی ابتداء ذہنی انقلاب سے ہوتی ہے۔

سبز کے دامن پر چوہوں کنڈلی مارے بیٹھے
جیسے کا جلا نکھستے پر خراڑوں کو گھیرے
سورج کی کرنوں سے ایسے جگمگا رہا ہے ٹکھڑا
جھل جھل جھل جیسے جھومر کے کسی دامن کا

جھلملیوں میں سے حیات کے تاریک پہلوؤں کی جھلک نظر آتی ہے بعض دفعہ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ مادری گیتی بارود عرصہ اپنے اندر دُرور کرب کی آہوں کو اس کے شعروں سے منظم نہا رہی ہے۔

اگرچہ جنگ کے شعلے ہمارے ملک سے دوہری لہریں اٹھیں گی مگر
ہمارا اشعار اپنے قلب پر محسوس کر رہا ہے اور اپنے ہم وطنوں کے احساس
وطنیت، جذبہٴ بغاوت اور ولولہٴ آزادی کو بیدار کرنے کیلئے ایک جنگی

نثرانہ چھیڑتا ہے ۵

بھرا من کی رنگیں وادی سے ہنگامہ گیر و دار اٹھا
 دُنیا کے سکوں کے پہلو میں ایک فتنہ حشر اُتار اٹھا
 مہستی کے بہا میں مطلع پر ایک ابو شہزادہ بار اٹھا

دشمن ہے قریب اور خطرے میں ہے ماہِ نقلے آزادی
 بیکار میں جنگ تاراٹھا اٹھ سائی اٹھ تلوار اٹھا

دل میرا نثارِ آزادی جاں مہری فدائے آزادی
اٹھ جلد کہ ظالم جھین نہ لیں تکتا لوائے آزادی

وہ غلغلہ یلغار اٹھا اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

ناموس و وطن کو غیروں کے پنجوں سے بچانے جاتے ہیں
 مدت سے ہیں ہایسی تلواریں پاس انکی مجھانے جاتے ہیں

دشمن کی ترہی لاشوں کا کھیل ان کو دکھانے جاتے ہیں
لابریق منہ آنا نہ اُٹھا اُٹھ

پھر حشیم براہ جرأت پہ لیلائے شہادت میدان میں
شاداب ہوا کرتی ہے صدائے قوم کی عظمت مردانہ

تلاواروں کے خونیں آنچل سے کھل جاتی ہے جنت میدان میں
گلابے طرب کا بار اُٹھا اُٹھا

(الغفر شیری)

لافاقی رزمیہ نظم کا اضافہ کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آجک ان ممالک میں بھی جہاں

جنگلی رانہ نہیں نکلیا۔ وہ حضرات آئیں جو اردو شاعری کو ”دگرہست“ کہلا کر

سید تارے نہیں پھیلائے جھوم سہے ہوا ایسے
جیسے کوئی دکنی کنواری مدھر لہجے کی جھوٹے
اندھیری دین ہے تھمدا نور تھمرا ارا بالا
راست کی دیوی کیا جنگل میں بھول گئی ہے بالا
عہد حاضر کا ہر شاعر اپنی لہجہ کار از انفرادیت میں پاتا ہے۔ اور اس لیے
اپنی انفرادیت قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ساغر کی انفرادیت
یہ ہے کہ وہ اپنے گیتوں میں ہندو علم الاصلہ (MYTHOLOGY)
کا پوند لگا کر ان کا امن ہند کے عہد عتیق کی تہذیب و تمدن سے باندد
دیتا ہے۔ یونانی علم الاصلہ نام ایک انگریزی شاعری کی تشبیہات،
استعارات اور تلمیحات کا مخزن بنا ہوا ہے۔ ساغر ناگ کو موت کی
گردن کی بجلی، شکر کا جوش، اور کالی کی جھانجن کھر کھر مخاطب کرتا ہے۔
اس نظم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ نظم گیت کی شکل میں
ہے۔ گیت ہماری حیلے کا ایک جزو ہے۔ اس لیے عوام الناس کے
دلوں کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ گیت نصیحت (INSTRUCTION)
کی بجائے اشارت (INSINUATION) پر مبنی ہے جو کسی ملک کے
اعلیٰ ترین ادب کا طغیائے امتیاز ہے۔

سازگار کی چند جدید نظمیں اور دو شاعری میں ایک نئے رنگ کا اضافہ کر رہی ہیں۔ "انسانی فرصت کہاں" ماحول اور زمانہ کی تمام بے چینیاں اور لگے رد عمل کا آئینہ ہے، شاعری حساس روح، بیرونی اثرات کو ایک اندرونی کیفیت سے ترتیب دے کر عجیب چیز جنم دیتی ہے۔ دورِ حاضر کی طلسمی کئی کہ شاعر یا عاشق یا محبوب، محبت کو ٹھکرا رہا ہے۔ پچھلی صدی کا کلاش اسے عاشق کا قصہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ترقی اور لمبندی کا نصب العین جس کے حصول کیلئے فی زمانہ انسان کو سچے معنی میں شین بن جانا پڑا ہے علم و مقصد اور اس کے مقابلے میں وقت کی رفتار، یہ سب ماقبل حفاظت کے اس نئے تارے نامہ میں ہم کو رہنمائی کر رہے ہیں۔ یہ سب ماقبل حفاظت کے

و زمانہ کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔

فارسی اور ہندوستانی تہذیب

کہ سلطنت کا مذاق ہر چیز میں سرایت کر جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی بہت جلد ہر لغز پر چوکنی اور ہندوستانیوں نے بلا تفریق مذہب ملت اس میں کمال حاصل کرنے کی کوشش کی۔ زبان میں بدلتے ہوئے حالات اور گروکستے یا بدلتے ہوئے کلچر کا عکس آنا لازمی تھا۔

فارسی اور ہندی الفاظ کا رد و بدل اور لہجہ دین غزنوی دور سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس عہد کے شعراء اود موثرین۔ فردوسی۔ عنصری۔ فرخی۔ اسدی۔ سنائی اور بیہقی کے ہاں ذیل کے ہندی الفاظ ملتے ہیں :-

بت۔ دشمن۔ شاردہ۔ کت بمعنی تخت۔ کو توال۔ نوہار (عبادت گاہ)۔ بیک۔ لگن۔ شل۔ کنارہ۔ چندن اور پانی۔

ابوالفرج رونی۔ جوشاہ ابراہیم اور اسکے بیٹے مسعود ثالث کے عہد کا شاعر ہے۔ اسکے کلام میں دند۔ جوہر اور جنت ہندی الفاظ پائے جاتے ہیں چنانچہ وہ کہتا ہے :-

شکل میل یک دندش نظر کن

بقول صاحب فرہنگ رشیدی دند ہندی لفظ ہے۔ فرہنگ آندراج میں لکھا ہے ۔

”گو یا اس فرس دنت باشد کہ لغت ہندی است“

لیکن میرے فاضل دوست پروفیسر حافظ محمود شیرانی کا خیال ہے کہ چونکہ ابوالفرج رونی لاہوری ہے۔ دند اس نے پنجابی زبان سے لیا ہے پیل یک دند سے شاعر کا مقصد ایک دانتا یا مٹی ہے۔ جب بھی گل میں پنجابی لفظ جٹ ہے جسے اردو میں جاٹ کہتے ہیں۔

جوہر سے مقصد اجڑوٹوں کی معروف رسم ہے۔ یعنی غالب شمنوں کا عہدہ پرآندہ ہونے کی صورت میں وہ اپنے مال و اسباب کو جلا کر اوناٹا حیاں کو کٹل کر کے اٹھتے تھے اور جب تک ایک ایک کر کے ہلاک ہو جاتے تھے نہ مورتے ۔

کسی ملک کی تہذیب۔ اس کا کلچر۔ اسکی زبان۔ اس کا ادب ایسی چیزیں ہیں جو صدیوں میں تشکیل پاتی ہیں۔ زمانہ کا ہوا۔ حکومت کے انقلاب۔ باشندوں کی مزاجی تبدیلیاں اور بیرونی ممالک اور اقوام سے اثر و تاثر۔ ادب۔ زبان وغیرہ کو سنسنہاں میں ڈھالتے رہتے ہیں زبان بالخصوص اسنے اثرات قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے کہ اسکی عہدہ ترقی قبول کا جائزہ لینا دلچسپیوں سے بڑ ہے۔

تو کہ ان ہندوستان کو فتح کرنا ایک اہم واقعہ ہے جس کے پناہ اثرات سے ہندوستانی تہذیب اور کلچر پر ایک کاری ضرب لگی۔ اور وہ جوت کھا کر جوانی طور پر فاختن کے خیالات و تصورات پر حملہ آور ہوا گرد و پیش کے حالات جس شدت کے ساتھ کسی قوم کے دل و دماغ۔ انکے خیالات۔ عادات و طوارح رکات و سکناات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسکی مثال اس سے بہتر شاید مل سکے۔ ترک اور مثل جب ہندوستان میں آئے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے اور ہندوستانیوں کے کلچر میں کوئی مشترکہ اوصاف ہی نہیں ہیں۔ مغل اور ہندوستانی۔ بول چال۔ رنگ ڈھنگ۔ آداب و اخلاق بہت سے پہلوؤں سے مختلف بلکہ متضاد تھے۔ اس اجنبیت کے باوجود ان دو تہذیبوں کا ایک دوسرے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا قوموں کے باہمی مدنی انحصار کی ایک ایسی دلیل ہے جسے آسانی سے چھٹا یا نہیں جاسکتا۔

مغل اور ہندوستانی کلچر میں پہلے تضاد ہوا۔ پھر گریز اسکی آشنائی۔ پھر کچھ کسی ربط۔ آخری شکل جو اس باہمی اعتق نے اختیار کی وہ حاکم و محکوم کا رشتہ تھا۔ ترک اور مغل ہندوستان میں فاتح بن کر آئے تھے اور ان کی زبان کچھ مدت کے بعد فارسی ہو گئی تھی۔ عربی کا مقولہ ہے ”انسان علی دین ملوک لہم“ یعنی رعایا بادشاہ کے دین کے تابع ہوتی ہے۔ زبان بھی علم و فن۔ صنعت و وسنائی اور اخلاق و اطوار کی طرح سلطنت کے اثر کی مغلوب ہوتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے

مسعود سعد سلمان نے کت (معنی محبت) - مار مار (آپس کی مار بیٹ) اور شرکال یعنی برش کال یعنی (برسات کا موسم) ہندی الفاظ استعمال کئے ہیں۔

حکیم ستانی غزنوی المصنف نے ۱۲۵۷ھ کے کلام میں ہندی لفظ پانی اور کو تو ال کوٹ والا یعنی مالک حصار) پائے جاتے ہیں۔
اسی طرح تاج الدین رینہ کے ہاں سیرا وین (۴۰ سیر کے منوں میں) ملتے ہیں۔

طبقات ناصری از سہاج سراج جو ۱۲۵۷ھ کی تصنیف ہے اس میں یہ ہندی الفاظ پائے جاتے ہیں۔
سبل (بھپڑ) - لک (لاکھ) - نو بہار (یعنی نو وار بمعنی عباد گاہ)۔

دقیقی شاعر نے بھی نو بہار لہر اسب نامہ میں استعمال کیا ہے۔
بلغ گزین شد ہاں نو بہار کہ بزدان پستیاں آن وزگار
مراں فاندرا فاشندے جناس کہ مرگہ را تازایاں این زماں
امیر خسرو کے یہاں کثرت سے ہندی الفاظ اور محاورے پائے جاتے ہیں۔ طوالت کے خوف سے میں ان میں سے صرف چند ایک کا ذکر کر رہا ہوں۔

ساغر (ساگر بمعنی حوض و تالاب) - راوت (راجوت) -
پایک (پیادہ) - (گپڑی) - بیڑہ - تنبول - دھانک (تیر انداز) -
بیمہ (الچی و سفیر) - بیل - سیوٹی - کیوزہ - موسری -

تاریخ فیروز شاہی میں جو ۷۵۷ھ کی تصنیف ہے کم از کم ۸۰ ہندی لفظ آئے ہیں۔ ان میں سے بھی چند ایک سن لیجئے۔ گنجی (ایک قسم کی ٹراب) -
منڈہ (منڈی) - سوندھار (یعنی ادھار) - ادوی (یعنی بارہ دار) -
مار مار (یعنی سہمی بہیم) - سکھ آسن (پالکی) - ڈانگ (کھٹہ) - منڈل (مسلحہ و جماعت)

سیرالادلیا میں کئی لفظ ہندی کے آئے ہیں مثلاً لیگنسن
من روزہ - بھائی بمعنی قید خانہ -

مجھے اندیشہ ہے کہ اس فہرست الفاظ سے جن کی نیز لگیاں ایک
ہر لسانیات کے لئے دو سالانہ صد ہزار لکھاں لئے ہوئے ہیں

آپ آگتا گئے ہوں گے۔ اس لئے میں مختصر القلوب میں سے صرف چند ہندی کے لفظ پیش کر کے اس بحث کو ختم کرنا ہوں۔
جوتی - کھتر (بیالہ رکائی) - مراتبہ (مرتبہ) - لنگوٹی - چتر -

اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ نویں صدی ہجری تک فارسی زبان ہندوستان میں ہمہ گیر صورت اختیار کر چکی تھی۔ فارسی جانے والوں کی تعداد اس وقت تک بہت کم تھی لیکن ماحول کے گونا گوں اثرات سے فارسی زبان متاثر ہو رہی تھی۔ اور مجھے یہی دکھانا مقصود تھا۔

جس طرح ہندی الفاظ فارسی میں داخل ہو گئے۔ فارسی عربی الفاظ ہندی کتابوں میں دخل پا گئے۔ نہایت لمبہ ایک ان پڑھ شاعر ۱۵۵۷ء میں اس نے ایک کتاب "بیل دیو را سو" نظم میں لکھی۔ اس میں اور اس وقت کی دیگر ہندی کتابوں میں متعدد لفظ عربی فارسی کے ملتے جلتے نمونے کیلئے دیکھئے۔

مہل (محل) - ہجرت (حضرت) کھدا - سرتان (سلطان) -
سیاہب (صاحب) - بیوان (فرمان) - کھلک (خلق) - کلا
(کلاہ) - کباے (قبا) - پاگیا (پائے گاہ) - بابا بابا (بعض بعض) -
دنجب بات اس میں یہ ہے کہ فارسی الفاظ کو ہندی نے اپنی اصلی حالت میں قبول نہیں کیا۔ بلکہ اپنے مزاج اور اپنی ضرورت کے مطابق انہیں ڈھال لیا ہے۔ خلق کی خ کو ادا کرتے اور خ کا ڈول

خلق سے نکالنے کی تاب ہندوستانی سہل انگاری کب لاسکتی تھی۔ لہذا کھلک بنا دیا گیا۔ عین کو بھی ہندی کی ناز کی کا شکار ہونا پڑا۔ اور بعض بعض کا بابا بابا بن گیا۔ ص - س - ث - کو ہندی نے ایک ہی لامٹی سے بانٹا۔ اور حاء حلی اور ہائے ہوز بھی ہندی میں یکساں سے کو ہونا بھول گئیں۔ ص - ظ - ز وغیرہ ایک ہی ہم جنم ہو گئے۔ قاعدہ ہے کہ غیر الفاظ قبول کرنے سے پہلے زبان مناسی طرح انہیں اپنے مزاج اور میلان کی آگ میں ڈالتی ہے۔ کھٹنے کے بعد یہ الفاظ مختلف ساچوں میں ڈھلے رہتے ہیں۔ ج - اہل عرب کو نہیں بھاتی تو عملی زندگی سے چاروش ساوش بن جاتا ہے۔ ژ فارسی ایسی گوشہ آز زبان میں نہیں کھپ سکتی۔ لہذا کٹارہ لے کٹارہ کی صورت اختیار کی۔ درحقیقت ہر زبان کسی خاص ماحول میں پرورش پا کر ایک انفرادی

نور و نال نظر دیوزہ دارم کہ وصفت موسیٰ را بر نگارم
مفردات سے قطع نظر کہات کی داستان سننے جو اس سے کہیں
زیادہ دلچسپ ہے۔ ان محاوروں کو ملاحظہ فرمائیے اور پھر اندازہ
کیجئے کہ کس حد تک فارسی زبان ہندوستانی ماحول سے متاثر ہو چکی تھی
زمین فشن۔ معنی ”زمین پر سونا“ اس ہندوستانی رسم کا پتہ دیتا ہے
جس سے سلاطین و شہزادگان کی وفات کے وقت ماتم داری کے
ایام میں لوگ زمین پر سونے تھے۔ چنانچہ امیر خسرو کہتا ہے۔

”وز زمین فشن ہمہ آفاق شد پہلو کہو د“

بیڑہ تنبول گرفت۔ ”بیڑہ اٹھانا“ اس محاورہ کے جو معنی
غیاث اللغات میں لکھے ہیں۔ ان سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ محاورہ بھی
ایک خاص ہندوستانی رسم کی خبر دیتا ہے۔ صاحب غیاث کے
الفاظ میں ”در زمان سابق در سلاطین ہند رسم بود کہ پیش امرارائے
انصرام رسانیدن ہم بیڑہ بان می افستد۔ کیکہ آزار برداشتے انصرام
مہم بدتہ او واجب شدے“
ان کے علاوہ سینکڑوں ہندوستانی محاورے فارسی میں لعل گئے
اور مستند مصنفین کے ہاں ملتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

آوار کردن (آوارہ نیا)۔ گفتار گفتن (کہات کہنا)۔ مالاکلام
کردن (کسی سودے کا انقطاع کرنا)۔ نیشکر پاہل خوردن (ناٹھی سے
گنا گناٹا)۔ ع نشاید نیشکر پاہل خوردن (خسرو)۔ دند ان دشکم
بودن (پیٹ میں داری یاد آنت ہونا)۔ ع خور پنہ دندانش
درون شکم است (خسرو)۔ بیک چوب ہمہ را را دندانش و سب کو
ایک لاشی سے ہانکنا)۔ ع

خسرو زبان نشست گوہر ہر را۔ چنانچہ زبان نشست جوہر ہمہ را
شدانہ سناں شیخ و تیرا کلکت۔ زمین نہ بیک چوب مراں ہر ہر را
دست برگوش نہادن (کانوں پر ہاتھ رکھنا)۔
جان بہینی رسیدن (ناک بھی دم آنا)۔ ع

جان مردم رسید در بینی (خسرو)
چراغ بر کردہ طلب کردن (چراغ لیکر ڈھونڈنا)۔
ہگ از سر فردا آوردن (کپڑی اتارنا)۔ میرزا کرنا)۔ چو بیگ از سر فردا

ایسا چون بولائی سناؤ

موج باترنگ اپنے میں ادا کر لیتی ہے۔ اور کسی دوسری زبان کے الفاظ
کی دسترس اس تک اسی وقت ہو سکتی ہے۔ جبکہ وہ اسکے من کی موجود
کا خیال رکھے۔ نارنگی اچھا خاصا لفظ ہے۔ لیکن فارسی زبان کو پسند
نہیں۔ یہ خوش مزاج چاہتی ہے کہ نارنج ہو۔ اہل فارس جن کی اپنی طبیعت
کا عکس فارسی زبان میں ہے۔ نارنج کیوں نہ کہیں گے۔ آپ دیکھئے
نارنگی ہو کہ نارنج بات ایک ہے لیکن زبان کا مزہ مختلف ہے۔

ان تمام انقلابات کو نظر غور ملاحظہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے
کہ ہندوستانیوں کے فلسفہ اور تصور پرستی کا ایک سلسلہ عکس جو بدلتوں
ہندی پر پڑا تھا۔ اس سے زبان میں ایک میدانی نشست رو دریا کا پھیلاؤ
آگیا تھا۔ ہندی زبان نہایت سیدھی سادھی اور صاف زبان تھی۔ لیکن
کہ باہر۔ اسکے الفاظ میں رس تھا۔ اس کے تصنع سے پاک جملوں
میں گھلاوٹ موجود تھی۔ لیکن اس میں اس وسعت بیان کا فقدان تھا
جو فارسی کا طرہ امتیاز ہے۔ فارسی کے اچھوتے لفظوں تجلیل میں
رچی ہوئی ترکیبوں اور نفاذ داں پیہم رواں ہر دم حواں اشعار و
مطالب نے ہندی مصنفوں کے دل موہ لئے۔ اس لئے یہ کہنا کہ
فارسی زبان کا اثر ہندوستانی زبان پڑی حاکم و محکوم کے رشتہ کار ہو
منت ہے قد سے سطحی نظریہ ہے۔ جھوٹا درش ایسی ترکیب یقیناً
سلطان کی خوشنودی کیلئے نہیں تھی۔ بلکہ ہندی اور فارسی الفاظ کے
ریلے الجھاؤ سے ایک جینیادی احساس اور ضرورت کی ترجمانی کرتی ہوئی
معلوم ہوتی ہیں۔

نویں صدی تک کی فارسی تصانیف میں ہندی الفاظ کے دخل
کی راسم کہانی میں مختصر عرض کر چکا ہوں۔ اب ملک الشعراء نے علامہ جانی
ابو طالب کلیم کی ایک مثنوی کے چند اشعار پیش کرتا ہوں۔ تاکہ وہ سلسلہ
مقلیدہ دور سے مربوط ہو جائے۔ دیکھئے کس بے تکلفی سے ہندی لفظ
استعمال کرتا چلا جاتا ہے۔

منہ بر وعدہ تنبویاں دل کہ خنجر خون آزونیت حال
زخیرن مشستہ دھوئی چہ گویم ازاں بے پردہ مجو بے چہ گویم
بتان را چوت و شیخ زادہ شکیب عاشقان بر باد دادہ
چہ چہ شعلہ شمع ست بے دود کہ آتش می زند بر زمین عود

آوردند بہ حرمت ماند (شمس سراج)۔

ایون فرود آوردن (افزون اترجاءنا)۔

دوران آمدن (چلک آنا)

خالہ کا گھر۔ ایک ہندوستانی محاورہ ہے۔ ضیاءیری ہی محاورہ ہنمال کرتا ہے "چنانکہ خوردگان نازیں درخانہ خالگان مہال روند" ان کی خوشی اسی ہی ہے۔ خوشی ایشال میں است (مفتح القلوب) اپنی گرہ سے خراج کرنا۔ خرچ و اخراجات اگرکہ خود کردن کشمس سراج غفیف)۔

جان سے تو جہان ہے۔ اول جان بعدہ جہان۔ (مفتح القلوب) آدھی کو چھوڑ ساری کے پیچھے دوڑنا۔ نیم نان گزارشتہ برائے تمام نان بڑ۔ مجھ سے کیا لیکا۔ ازمن چہ خواہد گرفت۔ (مفتح القلوب) اگر اپنی خیریت چاہتے ہو۔ اگر خیریت خود بخواری۔ ان تلوں میں تیل نہیں۔ خالے برخش دیدم و گفتم کہ تیل است۔

گفتا کہ بویست دریں تل تیلے (خسرو) بعض الفاظ کے معنی میں ہندوستانی ماحول نے نئے مفہوم پیدا کر دیے۔ جن سے اہل زبان کے کان نا آشنا ہے۔ مثلاً متحرک۔ بمعنی چالبار۔ یہی حال لفظ حرکت کا ہے۔ کابل۔ بمعنی ڈرپوک۔

خوش۔ بمعنی شاد و خرم۔ ایرانی فارسی میں بمعنی مرغوب آتا ہے روشنائی۔ بمعنی مرکب یعنی سیاہی۔ سرکار۔ بمعنی خزانہ۔

چنانچہ تاریخ فرشتہ میں ہے۔ اگر کم شود کہ تریاک محبکہ کہ درخطامی باشد و بالفعل ازان درکار موجود است ہیا ورمیم۔

غصہ بمعنی خشم و طیش۔ ایرانی فارسی میں بمعنی اندوہ لگو گہ استعمال ہوتا ہے۔

شد اندر غصہ شادی ثمان والا

مدد جست از پناہ حق تعالیٰ (خسرو)

فارسی اور ہندی کی اس باہمی کشاکش اور کیمیا گری کی تصویر مغلیہ سلطنت کے عروج و زوال میں کھینچی ہوئی ہے۔ مغل جب ہندوستان میں آئے تو شان و شوکت کے دلدادہ اور جوش و خروش کی زندہ مثال تھے۔ آہستہ آہستہ ہندوستانی رائج کے ضمیر نے ان پر اثر کیا۔ ان کی شاعری جو اس وقت رزمیہ شہیوں اور استعاروں سے مملو تھی۔ اب بزم طرب اور محفل عشرت کے کلمات میں لکھ گئی قصیدہ میں جنگ و جدال کی رمزی کم نظر آئے لگیں۔ حتیٰ کہ محمد شاہ رنگیلے اور بہادر شاہ کے زمانے میں استعاروں اور تشبیہوں کی ماہیت بالکل ہی بد گئی۔ اور کیوں نہ بد گئی۔ اٹو العزیز اور حب جاہ کی جگہ سہل انگاری اور عیش و عشرت نے لے لی تھی۔ درباری شاعر اپنے سر پر کے بغیر زندہ ہی کس طرح رہ سکتا ہے۔ اس نے وہی کچھ بیان کیا جو اسے نظر آیا۔ فارسی کے اُچھلنے پھٹنے جیسے اب نرم و درویدان چمکے تھے۔ پہلے زلف کو کہہ کر چمکائیں۔ اب کو خوشتر۔ مڑگاں کو تیر اور آنکھوں کو قاتل و سفاک باندھا جاتا تھا۔ اب نقشہ و سنبھل یا سمن اور رنگس وغیرہ کو کامل استعاروں کا رتبہ حاصل ہوا۔ قصیدہ کی جگہ غزل نے لے لی۔ بلکہ غزل کی آمد شروع ہو گئی۔ تصوف کو عروج ہوا۔ ہندوستان کی فضا اسکے نئے موزوں تھی۔ اسلامی تصوف میں "مگر و چیلہ" اور بھگتی مسک کے پیر و طہیج میں "پیر و مرید" کے الفاظ اپنا نئے گئے۔ اس استراق سے دونوں زبانوں اور قوتوں میں ایک گفت و سہا ہو گئی۔ مغل اور ہندوستانی آرٹ اور کالج نے ایک دوسرے کے قریب آنا چاہا۔ اردو زبان ان دونوں کے اثر و تاثر سے ہی سنواری۔ لیکن اس کا ذکر میری تقریر کی حدود سے باہر ہے۔

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو دہلی)

خود فریب

ترے حریمِ محبت میں آؤں گا امشب جواں ستاروں کی کرنوں پہ گاتا آؤں گا
صدائے ماہ سے جب جھللاؤنگے کوکب چراغِ ساغر و مینا جلاتا آؤں گا

بہار تیرے لئے میرے دل کے داغِ نسی میرے لئے ترے عارضِ چمنِ بدامن ہیں
یہ میری آنکھوں کے آنسو ترے چراغِ نسی تری نگاہ سے میرے چراغِ روشن ہیں

یہ سامنے کے دریچے میں دیکھ رازِ حیات! کہیں زباں پہ نگاہیں ہیں، آنکھیں ہیں باتیں
کہیں دھندلے ہیں دن اور نور میں برسات کہیں نہ دن ہے نہ ہستی ہوئی سیدہ راتیں

مگر نہیں۔ تری محفل میں آج آؤں گا
ہزار اشک ہوں آنکھوں میں مسکراؤں گا

د ک

ایوانوف

روسی مشہور افسانہ نگار چیخون کا ایک شاہکار
(چوتھا ایکٹ)

(دورِ ما)

دوبلے ہو جاتے

لبیڈیو۔ (ہنستا ہے) اس کا سر دیکھنے میں چھوٹا ہے لیکن اس میں شاندار خیالات کی شدت ہے، جتنی سمندر میں مچھلیوں کی۔

شیشلسکی۔ یہ ان معاملات کا تو ماہر ہے۔

لبیڈیو۔ خدا اعلان کرے تمہارا مائیکل ماسلوچ تم دل خوش کر دیتے ہو (ہنسا بند کر دیتا ہے) ہلوگ بک بک کے جا رہے ہیں لیکن واو کا کایا ہو گا۔ ایک دو راور (تین گلاس شراب پھر تاسے) ہم لوگوں کی بہتر صحت کیلئے (سب پیتے ہیں اور کچھ کھاتے ہیں) ہماری پرانی سٹج مہرنگ مچھلی بہترین ناشتہ ہے

شیشلسکی۔ نہیں کلڑی زیادہ اچھی ہوتی ہے..... دنیا کی پیداوار سے لیکر اب تک بڑے بڑے علماء سوچ سوچ کر ٹھک گئے۔ لیکن ٹکا دگرڈی سے بہتر کوئی چیز اب تک نہیں سوچ کے (پیوٹر سے) پیوٹر چارم کچھ کلڑی لے آؤ اور باورچی سے کہو کہ ہمارے لئے چار پیاز کے سموسے تیل دے اور گرم گرم بھیجے۔ (پیوٹر باہر چلا جاتا ہے) لبیڈیو۔ واو کا کے ساتھ کیوٹر مچھلی بھی بری نہیں ہوتی لیکن اسکو استعمال ذرا سلیقہ سے کرنا چاہئے۔ ایک چھٹا تک پیوٹر سے کو

دو۔ پرانی پیاز اور ذرا سے زیتون کے تیل میں ملا لو۔ اور دو تین قطرے لیون کا عرق ڈال کر کھاؤ۔

نہایت لذیذ ہو تا ہے اور اس کی تو خوشبو خیرت انگیز ہوتی ہے بورکن۔ مٹی ہوئی گجن مچھلی بھی واو کا کے بعد بہت مزیدار ہوتی ہے لیکن اسے تیلے کا طریقہ معلوم ہونا چاہئے۔ صاف کر کے پاؤر وئی

ایشیا جون، جولائی ۱۹۷۷ء

روانوو کے مطالعہ کا کردہ ایک کھنے کی میز جس پر کاغذات، کتابیں سرکاری لغات، کھلونے اور ریو اور بے ترتیبی سے پڑے ہیں کاغذات کے قریب ایک لیپ، دو دھکا قزاق ایک رکابی میں مچھلی، کچھ روٹی، اور کلڑی کے ٹکڑے، دیواروں پر نقشے، تصویروں، بندوق، پستول وراثتی اور کوڑے لٹکے ہوئے ہیں، دو پہر کا وقت ہے۔

شیشلسکی، لبیڈیو، بورکن اور پیوٹر شیشلسکی اور لبیڈیو کھنے کی میز کے قریب بیٹھے ہیں، بورکن اسٹیج کے بیچ میں کرسی پر پھیلے بیٹھا ہے، پیوٹر دروازے پر کھڑا ہے۔

لبیڈیو۔ فرانس کی پالیسی واضح اور مستحکم ہے..... فرانسیسی جانتے ہیں کہ ہمیں کس چیز کی ضرورت ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ سموسے کھائیوالوں کی کھالیں اور جرمنی کا قصہ بالکل مختلف ہے۔ جرمنی کے آنکھوں کے عارف فرانس کے علاوہ اور بھی بہت سے ہیں..... شیشلسکی۔ ہمسلا..... میں سمجھتا ہوں کہ جرمن قوم بزدل یا ذوق نہیسی بھی بزدل ہیں وہ صرف ایک دوسرے کے ساتھ زبان درازی کر رہے ہیں، یقیناً جانو کہ معاملہ اس سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ وہ جنگ کبھی نہیں کریں گے۔

بورکن۔ اور میرا خیال ہے کہ جنگ کی ضرورت بھی نہیں۔ آخر اسلام مسلح ہند کا مگر یہاں اور اخراجات کا فائدہ کیا ہے؟ میں نہیں بتاؤں گا کہ میں میں کیا کرتا۔ تمام ملک کے کتوں کو جمع کر کے ان کے جسم میں نشتر کے ذریعہ ایک ہنگامہ پھیلا کر اوزان کو دشمن کے ملک میں چھوڑ دیتا، ایک مہینہ کے اندر اندر تمام دشمن کتے کے کاٹے سے

کے گواہ میں ملا کر اتنا ملنا چاہئے کہ سوکھ جائے اور چہانے میں
کر کر کرنے لگے..... کر..... کر..... کر.....
شیشلسکی: کل مادام بیاکن کے یہاں ایک بڑی اچھی چیز کھانے میں آئی...
ساگ.....

لیبیڈیو: میں کہوں.....
شیشلسکی: لیکن خاص طریقے سے پکانی ہوئی۔ یوں سمجھو کہ پیاز، کنول کی
پتیاں اور کئی طرح کے مصالحہ کے ساتھ ملا کر جیسے ہی ڈھکن اٹھایا گیا
ایک بھاپ نکلے اور خوشبو..... نہایت لذیذ
لیبیڈیو: کیوں دو ستو کیا خیال ہے، رہے ایک دو اور (مبہینے ہیں)
ہماری بہترین صحت کیلئے (گھڑی دیکھتا ہے) مجھے افسوس ہے کہ میں
نکولائی کا انتظار نہیں کر سکتا۔ اب چلنے کا وقت ہو گیا ہے تم کہتے ہو
کہ تم نے مادام بیاکن کے یہاں ساگ کھایا اور ہم نے ابھی تک ساگ
دیکھا بھی نہیں۔ اوہاں یہ تو بتاؤ کہ تم مارغاں کے یہاں کیوں گھے
رہتے ہو؟

شیشلسکی: (بورکن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کیوں آپ ان سے میری شادی
کرنا چاہتے ہیں

لیبیڈیو: شادی! اے بھئی تمہاری عمر کیا ہے؟

شیشلسکی: باسٹھ برس

لیبیڈیو: شادی کرنا بہترین عمر! اور مارفا سے تمہارا جوڑا بہت خوب نہوگا
بورکن: سوال مارفا کا نہیں اس کے آدمیوں کا ہے۔

لیبیڈیو: اور میری کچھ فرمائے۔ مارفا کے روپے اسکے بعد
حوصلہ کیجئے گا۔

بورکن: جب انکی شادی ہو جائے گی اور حبیب روپوں سے لد جائیگا۔
تب کہے گا کہ کرنے کا حوصلہ ہے کہ نہیں۔ انکی قیمت پراپکو
رنگ آئے گا۔

شیشلسکی: اور جانتے ہو آپ اس معاملے میں بڑے خلوص کا اظہار فرما رہے
ہیں ان علامہ زمان کو یقین ہے کہ میں وہی کروں گا۔ جو یہ فرماتے
ہیں۔ اس سے شادی بھی کروں گا۔

بورکن: کیوں نہیں یقینی۔ کیا تم کو بھی اس کا یقین نہیں؟

شیشلسکی: تمہارا دماغ چل گیا ہے..... مجھے کہاں کا یقین ہوا تھا
بورکن: شکریہ..... بہت بہت شکریہ۔ تو آپ مجھے یہ قوف بنانا چاہا
ہیں۔ پہلے تو کہا کہ شادی کروں گا اور اب فرماتے ہیں کہ نہیں کروں گا
..... کون بیہودہ آپ کا مطلب سمجھ سکتا ہے۔ اور میں زبان
دے چکا ہوں۔ تو تم اس سے شادی نہیں کرو گے؟

شیشلسکی: (کندھے ہلاتے ہوئے) تم اسے یہ سمجھ بیٹھے۔ عجیب دمی ہو
بورکن: (غصہ میں) اگر یہ بات سچی تو ایک شریف خانوں کو یہ نشان کر سکتے
تمہارا کیا مطلب تھا؟ وہ تو کانٹا نکس ہونے کے پیچھے پاگل ہو رہی
ہے، نہ سو سکتی ہے۔ نہ کھا سکتی ہے..... اور آپ اسکو

مذاق سمجھ رہے ہیں۔ یہ شرافت ہے؟

شیشلسکی: (انگی اٹھاتے ہوئے) خیر اگر میں یہ حرکت کر ہی بیٹھوں تو میرا
کیا ہوگا! صرف شرارت کیلئے میں جا کر شادی کر ہی لیتا ہوں۔
واللہ..... بڑا تماشا ہوگا۔

(لووو داخل ہوتا ہے)

لیبیڈیو: ڈاکٹر صاحب تسلیمات عرض ہے (لووو کی طرف ہاتھ اٹھاتا ہے)

اور گا (تا ہے) ڈاکٹر صاحب خدا کیلئے مجھے بچا لیے۔ جناب مجھے پر ۴۶
موت کی سمیت طاری ہے۔

لووو: کیا ابھی تک نکولائی (لیکن پوچھ نہیں آئے؟

لیبیڈیو: جی نہیں۔ میں ایک گھنٹہ سے ان کا انتظار کر رہا ہوں (لووو
یہ میں اسٹیج پر ٹہلتا ہے) کیوں بھائی اتنا بیٹرو و ناکی ہے
لووو: بہت بیمار ہے۔

لیبیڈیو: (ٹھنڈی سانس لیتا ہے) کیا میں جا کر عبادت کر سکتا ہوں؟

لووو: نہیں مہربانی کر کے نہ جائے! میرا خیال ہے وہ سو رہی ہے.....
(وقف)

لیبیڈیو: وہ بہت نیک عورت ہے (ٹھنڈی سانس لیتا ہے)۔

ساشا کی سالگرہ میں جب وہ میرے یہاں بیہوش ہوئی تو میں نے

اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ بیماری زیادہ عرصہ

تک زندہ نہیں رہیگی معلوم نہیں اسکو کیا ہو گیا تھا۔ جب میں۔

دوڑ کر اس کے پاس گیا تو دیکھا وہ لیٹی تھی اور موت کی زردی اس کے

ایٹھا جان، جولائی ۱۹۸۶ء

چہرہ پر چھائی ہوئی مٹی۔ اس کے پاس نکولائی گھٹنے پکے بیٹھا تھا۔ اور اتنا ہی زرد ہو رہا تھا جتنی وہ اور سا شادور ہی مٹی ایک ہفتہ تک میری اور ساشا کی یہ حالت رہی گو یا ہم لوگ چند عیا گئے ہیں۔
 شیبلسکی: (لو ووست) سائنس کے معزز علمبردار ذرا یہ تو بتائیے کہ وہ کون قائل دوران تھا جس نے یہ پتہ چلا یا کہ جن عورتوں کے سینے کمزور ہوتے ہیں انھیں تو جوان کی زیادہ آمد و رفت سے فائدہ ہوتا ہے یہ بڑی عظیم الشان تحقیق ہے یکس کا کارنامہ ہے! ایلوینٹسک کا ہاتھ میرے پیٹھک کا؟

لو ووجواب دیتے دیتے رک جاتا ہے اور ایک نفرت آمیز نظر ڈال کر چلا جاتا ہے)
 شیبلسکی: کیسی خشک کر دینے والی نظر مٹی.....
 لیڈیو: معلوم نہیں کس شیطانی جذبہ میں تمہاری زبان اس طرح چلنے لگتی ہے۔ اس کی تو ہن کیوں کی تنے؟
 شیبلسکی: (چراغوں انداز میں) تو وہ جھوٹ کیوں بولتا ہے۔
 یہ سب جھوٹ ہے میں اسے برداشت نہیں کر سکتا

لیڈیو: آپ کیسے جانتے ہیں کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے؟
 شیبلسکی: (اٹھ کر بیٹھنے لگتا ہے) میں یہ خیال برداشت نہیں کر سکتا کہ ایک زندہ مخلوق بلا کسی وجہ کے مر جائے۔ جھوڑا اس موضوع کو (کو شتم داخل ہوتا ہے)

کو شتم: رہا بیٹا داخل ہوتا ہے کیا نکولائی الیکز لوچ گھر پر نہیں؟
 اواب عرض ہے (جلدی جلدی سمجھوں سے ہاتھ ملاتا ہے) کیا وہ گھر پر نہیں؟
 یورگن: نہیں وہ باہر گئے ہوئے ہیں۔

کو شتم: (بیٹھتا ہے اور پھر جھینکے کے ساتھ اٹھتا ہے) اگر ایسی بات ہے تو خدا حافظ (ایک گلاس شراب پینا ہے اور پھر جلدی جلدی کچھ کھا تا ہے) میں جاتا ہوں..... بہت مصروف ہوں...
 تنک کر چور ہو گیا ہوں... کھڑا ہونا مجھے مشکل ہو رہا ہے...

لیڈیو: تم نازل کہاں سے ہو گئے؟
 کو شتم: بار بار ان کے یہاں سے..... ہم لوگ رات بھر وہ کھینٹتے

رہے۔ ابھی ابھی ختم کیا ہے..... میں تو پتہ گیا.....
 وہ بار بار تو چار کی طرح کھینٹتا ہے! (رونی آواز میں) ذرا سنو۔
 میں برابر بان کھیل رہا ہوں..... (یورگن کو مخاطب کرتا ہے وہ کھسک جاتا ہے) وہ ٹھکری چل پڑا لیکن میں پھر بان کھیلنا، وہ پھر ٹھکری چل پڑا..... نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہاتھ میں نہیں بڑا سکا۔
 (لیڈیو نے) ہملوگ چار چڑیا بولے۔ میرے ہاتھ میں ایکہ پیرو اور پانچ اور چڑیا کے پتے اور حکم کا ایکہ دہلا د اور پتے مٹی.....
 لیڈیو: (کانوں میں انگلیاں دیتے ہوئے) رحم کیجئے، خدا کیلئے مجھے بخشئے۔

کو شتم: (کاؤنٹ سے) دیکھتے ہیں جناب، ایکہ، بیوی، چڑیا کے پانچ اور پتے ایکہ اور دہلا د اور حکم.....
 شیبلسکی: (اس کو ہٹاتے ہوئے) چلے جاؤ میں تمہاری بات نہیں چاہتا، کو شتم، اور کیا ایک ایسی بد قسمتی کے حکم کے ایکہ پر پہلے ہی ہاتھ میں ٹرپ ہو گیا۔

شیبلسکی: (مز پرست ایک ریو اور اٹھاتے ہوئے) چلے جاؤ نہیں تو میں تمہیں گولی مار دوں گا۔

کو شتم: (ہاتھ ملاتا ہے) براہو اس کا.... کیا ایک بھی ایسا آدمی نہیں جس سے میں کچھ باتیں کر سکوں معلوم ہوتا ہے کہ میں آسٹریلیا میں پہنچ گیا ہوں، نہ کوئی مشترک دلچسپی ہے نہ ایک ورس سے ہمدردی..... سب کے سب اپنے آپ میں لگن ہیں.....
 ...خیر مجھے چلنا چاہئے..... دیر ہو گئی۔ (اپنی ٹوپی بھیج کر اٹھالینا ہے) وقت قیمتی ہے (لیڈیو سے ہاتھ ملاتا ہے) پاس (بقیمہ) (کو شتم چلا جاتا ہے اور دروازہ میں اودو تیانڈاروٹا سے ٹکرا کر ہٹتا ہے)

(اودو تیانڈاروٹا: (جینیتی ہے) خدا غارت کرے مجھے دھکا دیتے ہو۔
 سب لوگ: آ-آ۔ یہ تو ہر جگہ موجود رہتی ہے۔
 اودو تیانڈاروٹا: تو تم سب لوگ یہاں ہوا اور میں نے گھر بھر ڈھونڈ ڈالا۔
 گڈارننگ: میرے پچھلے ہونے فاختہ۔ کھانے کا مزہ لے رہے ہو؟
 (سمجھوں کو خوش باش کہتی ہے)
 ایشیا جون، جولائی ۱۹۲۷ء

لیبیڈو۔ آپ کس غرض سے تشریف لائے ہیں؟

اودوتیا: کام ہے جناب والا (کا روٹ سے) ایسا کام جس کا تعلق۔
آپ سے ہے حضور عالی۔ (چمکتی ہے) مجھے حکم ملا ہے کہ آپ کو
سلام کہوں اور خیریت دریافت کروں۔۔۔۔۔ میری
خوبصورت گویا نے مجھے تم سے یہ کہنے کا حکم دیا ہے کہ اگر
آج شام تم آکر اس سے ملاقات نہیں کرو گے تو وہ رورو کر
اپنی آنکھیں پھوڑ ڈالے گی۔ اس نے کہا، مائیدیراس کو الگ
بیجا کرکان میں رازدارانہ طریقہ پر کہنا۔ لیکن رازداری کی کیا
ضرورت ہے، یہاں پر ہم سب ایک دوسرے کے پرانے دوست
ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ گناہ تو کر نہیں رہے ہیں۔ ہم تو فریقین
کی رضامندی اور محبت کے ساتھ جائز طریقہ پر شادی کرانا
چاہتے ہیں۔ یوں تو میں ایک گنہگار عورت ہوں لیکن اب تک
شراب کا ایک قطرہ بھی پینے کی جرأت نہ کی تھی مگر اس موقع
پر ایک گلاس پیوں گی۔

لیبیڈو: اور میں بھی ایک گلاس پیوں گا۔ (گلاس بھرنا ہے) اور بڑھی
کبوتری تم پر تو سن وسال کا کوئی اثر بھی نہیں معلوم ہوتا تم
اس وقت بھی کافی بوڑھی تھیں جب تیس سال قبل میں تم سے
پہلے پہل ملا تھا۔

اودوتیا: ابھی میں سبوں کا شمار بھی معمول گئی۔۔۔۔۔ دو شوہروں کو
دخا چکی ہوں۔ تیسرے سے بیاہ کرنا چاہتی ہوں لیکن جہیز
کے بغیر کوئی مجھے قبول ہی نہیں کرنا چاہتا۔ آٹھ لاکھ ہوتے
۔۔۔۔۔ (گلاس اٹھاتی ہے) خیر خدا کرے کہ ہم لوگوں نے
یہ نیک کام جو شروع کیا ہے اسکی مہربانی سے انجسام کو
پہنچ جلتے۔ یہ دونوں زندہ رہیں گے۔ پھل پھولیں گے
اور ہم لوگ ان کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوں گے۔ اللہ کرے دونوں
میں محبت اور یکا گلت ہو (پتی ہے) یہ تو کڑوی دودھ کا
شیکری۔ (رہنٹے ہوئے لیبیڈو سے) لیکن جانتے ہو بڑا طرز یہ ہے کہ
لوگ واقعی سمجھتے ہیں کہ میں۔۔۔۔۔ حیرت انگیز بات ہے
(اٹھ جاتا ہے) کیا خیال ہے تمہارا پادشا واقعی میں یہ

یہ حرکت تیس کر رہی ڈالوں۔ صرف شرارت کے لئے۔۔۔۔۔
بڑھا کٹا ہڈیاں کیوں نہ چبائے پاشا این؟
(باقی)

ہندو مسلم اتحاد کا علمبردار

نئی زندگی

رسالہ

اردو زبان میں اپنی طرز کا پہلا رسالہ

نیرنگانی۔ ڈاکٹر سید محمود

نئی زندگی کا مقصد ہندو مسلم اتحاد ہے، اور اس
میں تمام تر ایسے ہی مضامین شائع کئے جائیں گے جو
فرقہ وارانہ کی کوکم کرنے اور اتحاد کے مقصد کو تقویت
پہنچانے والے ہوں گے۔

اگر

آپ کو ملک کے چیدہ چیدہ ہندو اور مسلم رہنماؤں اور
لکھنے والوں کے خیالات پڑھنے ہوں تو آپ نئی زندگی
منگائے جس کا ہر پرچہ نخبیدہ اور ٹھوس مضامین کا
بہترین مجموعہ اور معلومات کا ذخیرہ ہے۔

سالانہ چندہ ۵۰۰/- نمونے کا پرچہ

اسکی خریداری کتب خانوں کیلئے ناگزیر ہے

مینجر رسالہ نئی زندگی سلیمنسٹری زیر روڈ الہ آباد

کشتی کو شہر تو اسے بے تار کر دی ہے سہارے سمجھنے والے سمجھ سیکے مومن نہیں آپ پر کشتی کا کچھ بھی نہیں!!
قاضی عبدالغفار

پیش لفظ

کسی دلدوز فغیر پر اظہار تائید کرنا، کہ اگر باپ محفل نقاد و نسیحی کردادگی وادیں کملی ہوئی بازاریت ہے "پیش لفظ"، پڑھ کر جو طوفان اٹھے ان کے بیان پر نہ قدرت ہے نہ اظہار تائید کی ہمت۔ کہنا صرف یہ ہے کہ یہ شاہکار ایک تصنیف کا نام لے دیا ہے جو قاضی عبدالغفار صاحب نے بیگم ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے اصرار سے "جہاں نما" کے لئے عنایت کیا، اور یکم صاحبہ اشاکو عطا فرمادیا۔

یہ ایک چھوٹی سی پورا پوری کشتی تھی — کوئی بڑا جہاز نہ ملتا — جس کا حال نہیں سناتا ہوں۔ اس کشتی کے بادبان پارہ پارہ ہو چکے تھے اور اس کے پتو اور ٹوٹ چکے تھے اور ملاح کی نازشوں سے وہ محروم ہو چکی تھی۔ پھر بھی وہ مٹی ایک کشتی۔ کشتی ہی سخت اور مضبوط چٹانوں پر وہ بچی گئی۔ کشتی ہی ساحلوں پر اس لئے تنہا کی کہ دن اور کس میری کی راتیں بسر کریں۔ لیکن جن موجوں نے اسکو چٹا تھا وہی اسکو ٹھاکرے لگیں۔ پروردگار آغوش موج کی یہ داستان کوئی نئی تو نہیں ہے!۔

روحوں میں طوفان اٹھے ہیں جس طرح سمندروں میں — ایک ایسے ہی طوفان میں کسی کشتی کے غرق ہونے کا یہ قصہ ہے۔ اگر آپ سمجھنا بھی چاہیں تو سن لیجئے اور اگر سمجھنے میں کچھ حرج ہو تو شکایت کیجئے۔ کہنے والا اس بات کا ضامن نہیں کہ آپ سمجھ بھی جائیں گے!۔

اس سمندر کا داستان گونز جالے کب سے اپنی داستان بیان کر رہا ہے اور نہ جالے کب تک بیان کرتا رہیگا۔ لیکن اس داستان کا انجام تروہ بیان کر سکا اور نہ کوئی سننے والا اس کا تصور کر سکتا ہے۔ طوفان کی ایک موج یہ داستان بھی ہے لیکن پھر کیا ہوگا اگر اس موج کو اسے سمندر جدا کر دیں؟ میں جانتا ہوں کہ یہ آپ کے بس کی بات نہیں۔ یعنی موج سے شناسائی اور سمندر سے بیکارگی!۔

کسی ملاح نے موج اور کشتی کے اس لگاؤ کو اپنی ایک شنوی میں بیان کیا تھا اور کہا تھا کہ،

"موج اور کشتی الگ الگ دو نام ہیں لیکن حقیقت ایک ہے حقیقت میں یہ دو موجود ہیں۔ کشتی کے بغیر موج کی نمود کیا ہے؟ سوائے اسکے کہ وہ سمندر کی ایک ٹوکری ہے اور بغیر موج کے کشتی کیا ہے؟ سوائے چند تختوں کے جن کو بڑھی ہے اپنی آری سے کاٹا تھا اور اپنے ہتھوڑوں سے کوٹا تھا!"

شاعر کے ان تصورات کو تم جب زندگی کے سانچے میں ٹھاکرے دیکھو گے تب تم کو یہ خبر ملے گی کہ جس طرح سمندر بغیر موج کے بے بھان ہے اسی طرح موج بغیر کشتی کے اپنی قوت پر مغرور اور سر بلند نہیں ہو سکتی۔

ان طوفانوں میں جتنی ان گنت موجیں ہیں ان ہی لانعداد کشتیاں ہیں۔ ہر موج کو جو اٹھتی ہیں آپ شمار کیجئے اور ہر کشتی کو جو غرق ہوتی یا چٹان سے ٹکراتی ہے یا موجوں کے پھیرے ٹکے کھا کر کسی ویران ساحل پر الٹ جاتی ہے آپ گن لیجئے، ان کشتیوں میں بہت سی ایسی بھی ہوتی ہیں جن کو موجوں نے کسی پھیرے ساحل پر **پریک** دیا اور پھر کسی دن سمیٹ کر لے گئیں۔ ان ٹوٹی ہوئی کشتیوں کو بھی موج کے آغوش میں جگہ ملتی ہے۔ وہ بار بار ٹپکی جاتی ہیں اور بار بار اسی آغوش میں سمیٹ لی جاتی ہیں! جب تک ان کا ایک تھمہ بھی باقی ہے ان کے اور موج کے درمیان یہ لگن باقی رہتی ہے — تم اسے فلسفہ کہو گے اس کی عین حیات کہتا ہوں!۔

میں موج کا رقص اور موج کے رقص میں کشتی کی گردش — فقط تکمیل یہ ہے اور شاید اس کو استانوں کی اصطلاح میں جوانی کہتے ہیں۔

مجھے معلوم نہیں کہ کشتی کتنے چشموں اور دریاؤں سے گزرتی ہوئی کتنے ساحلوں کو چھوتی ہوئی کتنے سمندروں کے سینہ پر اچھلتی ہوئی کتنے بادلوں کی کوٹک اور کشتی بھٹیوں کی تڑپ سے آشنا ہوتی ہوئی۔ اس بظاہر آخری طوفان کے دامن تک پہنچی تھی جس سے میری داستان کا آغاز ہوتا ہے۔ بہر حال میں نے اسکو ایک ویران جزیرہ کے پتھر بے ساحل پر بہت شکستہ حالت میں پایا۔ وہ ایک ٹھکے ہوئے مسافر کی طرح ہے۔ اون قافلوں کا خروشن سن رہی تھی جو سمندر کے طوفان میں گزر رہے تھے لیکن ان تک پہنچ نہیں سکتی تھی — اسکی خشکی اور در ماندگی سراپا انتظار تھی — اسکی ٹھکن میں بھی آغوش موج کے ہنگاموں کی تمنائیں بیدار تھیں۔

کے سمندر کا نیلا پانی رات کی سیاہی سے اتنا سیاہ فام تھا کہ اگر چٹانوں کی سختی موجوں کے منہ میں کفن پیدا نہ کرتی جس کے دھبے بجلی کی چمک کے ساتھ نظر آرہے تھے تو آسمان وزمین کی وسعتوں میں ایک زہرہ نگار تر خروش کے سوا کچھ بھی باقی نہ رہا ہوتا۔ موجوں کے سینہ کو کشتیوں کو تپوٹا شیر کے پنجہ کی طرح چہرے تھے۔ ہوا کا وہ فرامنا۔ بادل کی گرج اور چٹانوں پر موجوں کے پتھیروں کی آواز — ارض و سما کی درمیانی وسعت میں یہ سارا خروشن بقا سے بقا اور فنا سے بقا کی منزلوں کا ایک پھیلاؤ تھا جس میں اس خطبہ کشتی کی جوانی نے ہزار و فصد بڑھاپے کی منہ لیں طے کیں اور ہزار دفعہ اپنے بڑھاپے سے جوانی کی طرف عود کیا۔ یہ بڑن اور لہجہ کی ایک سلسل داستان ہے برف سے زیادہ ٹھنڈے پانی کی پر خروشن موجوں کے عریاں نشاں اور مضبوط بازوؤں پر برف کو گالے اس طرح گر رہے تھے کہ اگر تاریکی نہ ہوتی تو سارا عالم سفید ہی سفید نظر آتا

جہازوں کی یہ رٹ تھی۔ ویران جزیرہ کے ساحل پر وہ آخری منظر میں نے دیکھا تھا جب پر خروشن اور غضبناک سمندر کی بے پروا موجوں نے اس کشتی کو اتنے جکڑ دئے تھے۔ اتنی دفعہ اچھالا اور گڑا بقا کہ اس کے رقص کی ہر لرزش سے ایک ایسی ٹھکن ترشح ہوئے۔ لگی تھی جسکو دنیا کے لوگ بڑھاپے کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ایسکین کیا طوفان کی موجوں کے جھکوں سے جدا ہو کر ساحل کی چٹانوں پر کھج جانا کوئی ایسی انتہا ہے جو کبھی اپنے آغاز کی طرف رجوع نہ ہوگی؟ یا اگر یہ مکان باقی ہے کسی دن پھر کوئی موج اس اونچے کشتی کو یا اس کے ٹوٹے ہوئے تختوں کو اپنی دامن میں لپیٹ کر بھاگی اور سمندر کے سینہ پر کھجی تو پھر کیا ان ٹوٹے ہوئے تختوں کی یہ انتہا بھی ان کے آغاز ہی کا دوسرا انتہا ہے؟ اور انہیں تو پھر کیا ہے؟

موسم سرما کی اندھیری رات تھی جس کی ظلمت کے سینہ پر ایک بے اختیار آرزو کی طرح ایک بے محابا تنہا کی صورت بجلی چمک رہی تھی کہ گویا غضبناک دیوتاؤں کی فوجیں مصروف پیکار ہیں۔ ان دیوتاؤں

۵۱ جہازوں کی یہ رٹ تھی۔ ویران جزیرہ کے ساحل پر وہ آخری منظر میں نے دیکھا تھا جب پر خروشن اور غضبناک سمندر کی بے پروا موجوں نے اس کشتی کو اتنے جکڑ دئے تھے۔ اتنی دفعہ اچھالا اور گڑا بقا کہ اس کے رقص کی ہر لرزش سے ایک ایسی ٹھکن ترشح ہوئے۔ لگی تھی جسکو دنیا کے لوگ بڑھاپے کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ایسکین کیا طوفان کی موجوں کے جھکوں سے جدا ہو کر ساحل کی چٹانوں پر کھج جانا کوئی ایسی انتہا ہے جو کبھی اپنے آغاز کی طرف رجوع نہ ہوگی؟ یا اگر یہ مکان باقی ہے کسی دن پھر کوئی موج اس اونچے کشتی کو یا اس کے ٹوٹے ہوئے تختوں کو اپنی دامن میں لپیٹ کر بھاگی اور سمندر کے سینہ پر کھجی تو پھر کیا ان ٹوٹے ہوئے تختوں کی یہ انتہا بھی ان کے آغاز ہی کا دوسرا انتہا ہے؟ اور انہیں تو پھر کیا ہے؟

» میں کیوں نہ ہوں سکون جب تک کہ تو باقی ہے۔ «
ویران جزیرہ کے ساحل پر شا عری جتیم نگران اس ٹھکن کو دیکھ رہی تھی اور فلسفی حیران تھا کہ اگر اس طوفان زندگی کا کوئی آخری مقام بھی ہے تو وہ کہاں ہے۔ کہاں ہے کوئی ایسا سکون مطلق جسکی خاموشی وادیوں میں سمندر سو جائے اور موج بے خروشن ہو جائے۔

ابھی مشرق کی حد نظر پر ایک مسرخ پردہ کی جھلک کو سمندر کی موجیں اپنے دامن سے دھور رہی تھیں اور رات کی ٹھکی ہوئی کشتی نے ساحل کے ایشیا جون، جولائی ۱۹۶۶ء

غضبناک سندرے آخری جھکے کے نشی کے تختوں پر کیلوں کی گر بہت دھیلی کر دی تھی اور اس کی ناہموار سطح پر دور سے ایک ادھیہ نظر آتا تھا جس پر مومیں اپنے بھاگ اڑا رہی تھیں۔ اس طرح جیسے برات کے دوہا کی سواری پر یا کسی تباوت پر بیچوں برسائے جاتے ہوں۔ دوہا کی سواری اور جنازہ کا درمیانی فاصلہ اتنا کم ہے کہ شاعر یا فلسفی جب جنازہ سے برات تک اور برات سے جنازہ تک منزلیں شمار کرتا ہے تو موت و حیات کے اس محور پر کچھ بھی نہیں پاتا سوائے ایک «عزم جہات» کے۔ اس کی نظر میں نشی کا ٹوٹا ہوا ہر تختہ بجائے خود ایک نشی ہے!

صاحبزادہ محمد علی خاں میکش
حیدر آبادی

م

چھا رہا ہے پھر اندھیرا، کل رہے ہیں پھر چراغ
 نا اُمیدی میں چمک دکھلا رہے ہیں دل کے داغ
 ایک گہری فکر میں کھویا ہوا ہے پھر شباب
 بن رہے ہیں "آج" کی آنکھوں میں شاید کل کے خواب
 رقصِ انجسم کے لئے، بزمِ فلک کا اہتمام
 لے رہا ہے پھر مرے اشکوں سے اندازِ حرام
 ہو رہی ہے زندگی پھر ایک خاموشی میں گم
 اک فریبِ مرگ میں، اک خود فراموشی میں گم

تو جو آئی، غم کو حسن جا ودانی مل گیا
آخری سانسوں کو ذوق زندگانی مل گیا

رکشا والا

”دیوی جی! آپ روزانہ کوٹھی جاتی ہیں نا؟“

”ہوں۔۔۔۔۔ کیوں؟“

”یونہی۔۔۔۔۔ اگر۔۔۔۔۔ قریب ہی کے رکشا پر۔۔۔۔۔ یہ کہہ کر رکشا والا ملتی لگا ہوں سے نکلے لگا۔

”اُف! بہت گرمی ہے ذرا تیز چلو۔“ ایک مرتبہ رکشا نے دروازہ دھستے پھولا کھا یا، بخوڑی دور چلنے پر رفتار بھر دھبی ہو گئی جیسے رکشا فاصلے کی بعد ہی پتہ لیوں کے ابھری ہوئی رگوں میں خون جم کے رہ گیا ہو، اس نے انگوٹھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

”سچ جی بہت گرمی ہے، بخوڑی ہی دور میں جان نکل گئی۔“

”ہاں تو روزانہ اسی وقت آپ کوٹھی جاتی ہوں گی۔۔۔۔۔؟“

”نہیں اس سے کچھ سویرے ہی، آج کچھ دیر ہو گئی ہے۔“

”بس بس آہستہ سائے والی کوٹھی میں۔“

”بہت اچھا سرکار۔“

”اُکے پیسے ہوئے مہارے؟“

”ہوئے! بھلا آپ نہیں جانتی ہیں۔۔۔۔۔ ہیں ہیں۔“

رکشا والے نے ایک کٹیف نہیں ہنتے ہوئے جواب دیا، روز کا آنا جانا

رہا ہوگا۔ آپ سے کیا چھپا ہے سرکار؟“

”اچھا یہ لو! دیکھو کل ساٹھ بجے ہی ہم کو فرصت ہو جائیگی، کل

سنیچر ہے اور ہاں سنو! پرسوں اتوار ہے، تم جانتے ہو نا کہ اتوار کوٹھی

رہتی ہے؟“

”جانتے ہیں دیوی جی!۔۔۔۔۔ ہم جی جب۔۔۔۔۔!!“

جیسے رکشا والے کے سامنے اس کے طالب علمی کے زمانہ کا سارا اتوار

ناچ گیا ہو

”دیکھ تم بھی جب۔۔۔۔۔؟“

”کچھ نہیں۔۔۔۔۔ یہی کہ ہم بھی جب پڑھتے تھے تو۔۔۔۔۔!“

”اچھا! تم بھی کبھی پڑھتے تھے۔۔۔۔۔؟ تم نے کہاں تک

تعلیم حاصل کی ہے رکشا والے؟“

”یہی معمولی سی چند کلاسیں سرکار۔۔۔۔۔“

”آخر کہاں تک تم نے پڑھا ہے؟“

”کیا کچھ کا پوچھ کر سرکار؟“

”ہم ضرور پہونچ جائیں گے، دیکھتے دوسرا رکشا نہ کر لیجئے گا۔“

”اس نے پیسوں کو انٹی میں رکھا اور پاس والے تیم کی چھاؤں

میں جا کر پسینہ سے تر گئی کوٹا کر کر سوا دینے لگا، جب دراجان میں جان

آئی تو پائپ پر جا کر ٹنہ تھک دھویا، پانی پیا اور پھر بڑا نا شروع کیا۔

دکھتی شریف میں یہ؟ آج کل کون غریب پر نظر کرنا ہے، کرایہ بھی تو بجا

نہیں دیا، دو پیسے زائد ہی دے دیئے، کل کہدوں گا، سرکار دو پیسے بستی

آپ نے دیئے ہیں۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔ شاید برامانیں، بڑوں سے زیادہ

بولنا بھی تو ٹھیک نہیں، مگر کل یہ ضرور پوچھوں گا اس طرف سے کس کے

رکشا پر آتی ہیں، شاید میرے ہی رکشا پر!“

”کشور نے بھی کبھی اچھے دن دیکھے لیکن آسمان تو کسی کے

دن ہمیشہ کیساں نہیں رہتے دیتا۔۔۔۔۔ گاؤں میں جو بیضہ کی وبا پھیلی

تو خاندان کا خاندان اجڑ گیا، ایک ایک مکان سے بے یک وقت پانچ

پانچ چھ لاشیں لٹکی گھٹیں، کوئی جنازہ اٹھاے تاک کو نہیں تھا۔

بڑا مولوڑانی کا، شاید کہیں سے ”کارا فنج“، بیشیوں میں بند بڑے

جارہے تھے ان میں سے کچھ شیشیاں کسی طرح ٹوٹ گئیں اور پوسے گاؤں

میں بیضہ پھیل گیا۔۔۔۔۔ جلگت پور جو آج کل ایک ویران اُداس

اور انسان بستی ہے کچھ دنوں پہلے پھلا پھولا، صدابہار گاؤں تھا، نہ جلنے

کشور نے اس جنم میں کون سا پروا دھکیا تھا یا کمزور اور غریب

ایشیا جون بولانی

کسان پر اس کے آبا و اجداد کے بے جا ظلم و تشدد کا ثمرہ تھا یہ کہ جسکی سزا دیکھا والا ہو کر ٹھگت رہا تھا۔ لوگ کہتے ہیں ضرورت ایجاد کی۔ مان ہوتی ہے، بہت ٹھیک کہتے ہیں لوگ، کشور آخر کرنا کیا، اس نے تعلیم بھی تو زیادہ نہیں پائی تھی، دسویں جماعت تک وہ بھی حقیر سے قبضے کے اسکول میں۔۔۔۔۔ آج کل تو کتنے بی۔ اے اے مارے مارے پھرتے ہیں۔ افلاس کی شدت اور بھوک نے سینکڑوں کو ادنیٰ لکھوں کی خادہ پڑی کیلئے آمادہ کر دیا ہے۔ کشور تو انکے مقابلہ میں کم پڑھا لکھا اور اچھا دہائی تھا۔۔۔۔۔ چہر بھی ایک تعلیم یافتہ سے زیادہ پاک طینت!۔۔۔۔۔ مگر پاک جتنی پیٹ نہیں بھر سکتی۔ اسے اپنا پیٹ پانا تھا۔ گاؤں کے کسی جٹے مانس سے رات دی ہوئی، جتنا اتم اچھی بھگوان لی دیا ہے جو ان ہتھیو b، اور تندرست ہو۔ پڑھے لکھے ہوشیار کیوں نہیں چلے جاتے وہاں کسی کے لڑکے کو پڑھانا اور کچھ نہیں تو کم از کم بھر پیٹ کھانے کو تو مل ہی جائیگا! مصیبت کے وقت دراسی دلجوئی بھی انسان سے نہ رہا سہارا ہوئی ہے، فلک زدہ کشور کے سامنے ایک دھندلا سا پر امید مستقبل ناچ گیا، اُس کے خیال میں ایک لہری زور لگئی۔ اسی روز پوچھنے ہی اُس نے باپ دادا کی نگری کو خبر یاد دہانی۔ شہر جاتے وقت اُسکے قدم من میں رکھ کے ہو گئے تھے۔ وہ چلا جا رہا تھا اور مڑ کر اپنی خیم بھومی کو نگہتا جاتا تھا۔۔۔۔۔ وہ جا رہا تھا۔ پر بہار باغوں ہرے بھرے کھیتوں، پُل اور اپنے کنوئیں کی منڈیوں کو چھوڑ کر جہاں گاؤں کی حسین، اٹھڑ کنواریاں بانی مہرت آتی تھیں۔۔۔۔۔ وہ چلا جا رہا تھا۔ بھوک کا مارا ہوا، اُن حسین اور سیلے نغوں کو چھوڑ کر جو برکھا کی سہائی رات میں دیا، اتنی سند کنواریاں مست ہو کر پھیر کر قی تھیں۔۔۔۔۔ اسے بچپن کے خوشگوار دن رہ رہ کر یاد آتے تھے وہ درختوں کو یا س میں ڈوبے ہوئے آنسوؤں سے آلودہ لٹکا ہوں سے دیکھتا تھا، درختوں کی دایوں کو تو عام وازنگی میں بے تحاشا پکڑ پکڑ کر چومتا جاتا تھا۔۔۔۔۔ لیکن وہ آگے ہی بڑھتا جاتا تھا کیونکہ اسے آگے ہی بڑھنا تھا۔۔۔۔۔ وہ زمانہ بیٹے اچھی زیادہ دن نہیں گزرتے تھے جب یہ اپنے بچوں کے ساتھ وہی دن بھر انہیں شاخوں پر دوڑا دل پٹا، کھیلتا تھا، اسکی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں، لیکن اس کے قدم آگے ہی

۵۴

اٹھتے جاتے تھے، کوئی اجنبی طاقت اسے روکتی تھی لیکن کوئی نامعلوم جذبہ اسے ابھی طرف کھینچتا تھا۔۔۔۔۔ دن پڑھے وہ شہر میں پہنچ در در کی خاک چھان ماری لیکن ہر جگہ ناکامی و محرومی، ہانپناٹ کفایت کی نوبت پہنچ کیونکہ ایک دیہاتی اگر تلاش معاش میں شہر کر کے کم از کم ایک دو وقت فاقہ نہ کرے تو وہ دیہاتی کیسے کھلا سکتا ہے۔۔۔۔۔ بر پیٹ کی مار بڑی ہی بری ہوتی ہے، مرنے لیا نہ کرتا مجبور اُلٹے رکت کھینچ کر پیٹ کا جہنم بھرنا پڑا، وہ جوان تھا، تندرست او چہرگاؤں کا پرستہ والا کچھ ہی دنوں میں اُسے رکشا کھینچنے کی عادت سی ہو گئی۔ یا یوں سمجھئے کہ غربت، مجبوری اور وقت کے تقاضوں سے مجبور اُس پر کچھ سکھلا دیا۔ اپنے پیٹ بھرنے کیلئے روزانہ پیسے کمالیتا اُسے زیادہ کسانے کی فکر نہ تھی۔ اس کا تھا ہی کون؟ کس کیلئے یہ کمانا؟ مالک کا بھادرا اور اپنی خوراک کے لئے روزانہ پیدا کر لیتا تھا۔۔۔۔۔ مگر اس کا دل اس زندگی سے غیر مطمئن تھا، درد و کرب کی لہر ہی اُسکے دل میں اس طرح اٹھیں جیسے سمندر میں طوفان، وہ رہ رہ کر اس تکلیفہ خیال کو دل سے نکال دینے کی اکثر کوشش کرتا۔۔۔۔۔ نام کام کوشش! کیونکہ بعض وقت بلکہ اکثر ٹھگ، گاؤں اپنے بیگانے کی یاد اسکے دل میں بے طرح چٹکیاں لینے لگتیں، وہ ہمیشہ کھو یا، کو یا، چپ چپ سا رہتا۔ اور ول کی طرح اپنے درد دکھ کی کہانی کو لوگوں کو سننا کر وقتی طور پر اسے اپنا غم ہلکا کرتا بھی نہ آتا تھا، مزدور تھا مگر غربت اسکی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، اس غمی کی حالت میں بھی اسکی خودداری اچھوتی تھی، انہیں تفکرات میں کبھی کبھی اسکی طبیعت بری طرح بگڑ جاتی اور اس وقت اسکو اپنی جھوٹی بہن پر بھیا یاد آجاتی بوختوں اُس کا سر دبا کر قی تھی۔ اٹھ کر اپنے تازگ باغوں سے بانی پلائی تھی۔۔۔۔۔ اس کا دل ٹپ کر رہ جاتا۔ وہ کسی دن تو کچھ کماتا بھی نہیں تھا، اس جب لوگ پوچھتے وہ کمات کیوں نہیں؟ تو صاف جواب دیتا کس کیلئے کمائیں زیادہ کم کر کیا ہوگا؟۔۔۔۔۔ بات آتی گئی ہوئی۔۔۔۔۔ آج بھی وہ منول تھا، کوئی بات یاد آگئی ہوگی۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا، یہ سوچ رہا تھا کہ روزانہ اور رکشا والوں کی طرح مجھے بھی چند مقررہ سوار یاں ملجائیں اور مجھے پر حساب ہوا کرتا تو اس طرح

گلیوں کو چوں میں مارے مارے پھر سے نجات بلجائی، اس فکریں
 ڈوبا غیر ارادی طور پر رکشائے ہوئے گرل اسکول کے سامنے جا نکلا
 ایک نازک اور سر بلبی آواز آئی ”اے رکشا! چورنگی تک چلو گے؟“
 —————
 ”کشمور نے گھوم کر دیکھا کچھ بڑھا اور جھجکا، جھجکا اور بڑھا۔
 ہاں حضور! رکشا حاضر ہے!۔۔۔۔۔ آج تک اس نے کسی نئی
 کورکشا پر نہیں بٹھایا تھا، اسے شرم محسوس ہوتی تھی کہ عورت کو جھجکا کر
 کیجیے، کتنی بار تو اس نے بہت سی لڑکیوں کو بوسہ دیا تھا کہ گرل اسکول
 کہ رکشا خالی نہیں ہے!۔۔۔۔۔ لیکن آج پر میلہ کی آواز نے خلاف
 معمول نہ جانے کیوں اسے انگارہ کر دیا۔ شاید یہ وجہ ہو کہ آج
 صبح سے اس نے ایک پیسہ بھی نہیں کمایا تھا۔۔۔۔۔ اس نے گدڑی
 جھاڑ دی، دھوپ سے بچا وکیلے چھتری اٹھا دی۔ ان انتظامات پر
 اسے ایک خط محسوس ہو رہا تھا، اس نے آج تک کسی خانوں سے
 اتنا کھل ملکہ باتیں بھی نہیں کیں۔

اس دن کے بعد وہ روزانہ وقت سے پہلے ہی اپنا رکشائے
 گرل اسکول کے بڑے پچا تک پر کھڑا رہتا، سب بڑے میلا پر چڑھتا
 یہ اسے کبھی بہت تیز کبھی بالکل آہستہ کبھی ذرا دھیمی رفتار سے بجاتا
 اور راہ میں کوئی نہ کوئی بات ضرور چھیڑتا، گفتگو کے مختلف پہلو نکالتا
 کچھ نہیں تو کم از کم یہ کہتا کہ سرکار آپ بڑی اچھی ہیں! زیادہ کس کر
 کیا ہوگا حضور، بس آپ کو روز بچاتا ہوں، دو تین سواری شامل ہو
 سنیما اونیا کی بلجائی ہیں، بس داں روٹی بھر پیٹ کھاے، کو جو جاتا ہو
 —————
 ”پر میلہ اسکی باتوں پر ہوں ہاں کر دیتی اور جب
 کچھ جواب نہ دیتی تو کشو گھوم کر کشا پھر آپ ہی آپ ہنس کر کہنے لگتا
 ”سرکار بہت بڑھتی ہیں، کشا تک پر سرکار پڑھتی ہی رہتی ہیں!“
 ”متہار کیا نام ہے رکشا والے، ایک روز پر میلہ لے یو نہی
 پوچھ لیا۔ میرا نام؟۔۔۔۔۔ میرا نام کشور ہے سرکار۔۔۔۔۔
 ”اچھا کشور تم رہتے کہاں ہو؟“ کشو سوچنے لگا کیا جواب
 دے۔ اس کا گھر ہے نہ ٹھکانہ۔ وہ تو فٹ پاتھ ہی پر اپنا وقت
 بتاتا ہے۔

—————
 ”پر میلہ کو کشور کی عجیب و غریب، جھولی جھالی، بھکی بھکی

اوٹ پٹانگ باتوں سے کچھ دلچسپی سی ہوگئی تھی، اس کا راستہ مزے
 سے کٹ جاتا تھا۔۔۔۔۔ آج شہر میں پہلی مرتبہ کسی نے اتنی مدت بعد
 کشور کو کشور کہہ کر پکارا تھا، کشور کا دل بھر آیا، اس کی آواز جھنجھکی
 اسے اس وقت اچانک بھری طرح یاد آ رہا تھا۔۔۔۔۔ وہ میرانی
 اور تنبا ہی!۔۔۔۔۔ پر اس نے چونک کر فوراً جواب دیا، ”ہاں گے
 کہاں سرکار، چار رات ہوگئی وہیں رہ گئے کشور نے بڑی مشکل سے
 ان الفاظ کو یاد کیا۔ اسکی آواز بھر بھر سی تھی اور ہونٹ بری طرح
 خاپ رہے تھے، پر میلہ نے متعجب ہو کر پوچھا کہ کشور؟ کیا بات
 ہوئی؟ شاید تم۔۔۔۔۔“

”نہیں کچھ نہیں کہاں کچھ ہوا سرکار۔۔۔۔۔ آہ! کبھی کبھی
 گھر بری طرح یاد آ جاتا ہے، آج بریکر آپ نے۔ میرا نام پوچھا۔
 میں تو اپنا نام جیسے بھول ہی گیا تھا۔ میرے کان پر سوں سے
 اپنا نام سننے کو ترس رہے تھے، دیوی جی! میں نے تو یقین کر لیا تھا
 کہ میرا نام کشور والا ہو گیا ہے۔“

”تو کشور! یہاں متہار کو کوئی بھی اپنا نہیں ہے کیا؟“

۵۵ ”وہ آپ کیا غیر ہیں سرکار؟۔۔۔۔۔ آپ بھی تو اپنی ہی جیسی

ہیں۔۔۔۔۔ جب سے میں آپ سے ملا ہوں میرا بہت کچھ دکھ درد
 ہلکا ہو گیا۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بہت دن بعد کوئی اپنا
 ملا ہے جس نے مجھے کشور کہہ کر پکارا۔۔۔۔۔“

”ہوں۔۔۔۔۔ پر میلہ خاموش ہوگئی، کشور لرز گیا
 اس سے کوئی گستاخی تو نہی ہوگئی۔ ایسا ہی ایک دن
 ادھر ادھر کی گپ کرتے ہوئے کہا، ”سرکار!، پھر وہ عجیب سرنگی
 کی حالت میں پر میلہ کو سننے لگا، اس کے پاس الفاظ نہیں بڑھنے
 کیلئے۔۔۔۔۔ لیکن پر میلہ کی مہربان نگاہوں نے تہلا دیا تھا کہ وہ
 خفا نہ ہوگی۔ جن الفاظ میں چاہے وہ باتیں کر سکتا ہے۔

”ہاں! تم کہاں جاتے تھے کشور؟“ پر میلہ نے جواب
 دے دے در کی کہانی سن کر اس پر ترس کھانے لگی تھی پوچھا۔۔۔۔۔

”حضور کا نام؟ کشور نے دبی زبان سے کہا، پر میلہ ہنس دی او
 ہنسنے ہوئے اس نے جواب دیا ”میرا نام تو پھل کر گیا ہو گا؟“

ایشیا جون۔ بولائی

کشتور چپ ہو گیا، اس نے سوچا جس توہے، نام پوچھ کر میں کیا کروں گا؟
 — وہ بہت ہنسیاں ہوا، خود پر لعنت طاعت کرنے لگا اس سے
 ایسی غلطیاں کیوں ہو جایا کرتی ہیں — پر میلانے محسوس کیا
 کشتور اتنی اس حرکت پر شرمندہ ہے، اس نے کہا: در مجھے پر میلا دیوی
 کہتے ہیں، تمہیں یہ نام پسند ہے؟ —

”بہت پسند ہے سرکار۔ ہاں ایک بات بہت دنوں سے سوچ رہا تھا، یاد نہیں پڑتا تھا۔“ کوٹھی سے آپ کسی کے رکشہ ہی پر تواتی ہوں گی۔“

”کوٹھی سے تو میں بابو جی کی کامیں آتی ہوں، لیکن پھر وہی کار بابو جی کو لیکر بائی کورٹ چل جاتی ہے، اسی لئے اس طرف سے ہمیں رکشہ پر جانا ہوتا ہے۔۔۔۔۔ اگر تم کم سویرے پونچھتے ہی کوٹھی پر پہنچ جاؤ تو ہم بابو جی سے کہہ کر تمہیں کوٹھیک کر لیں۔ اکثر مجھے دیر ہو جایا کرتی ہے اور بابو جی کا کام حرج ہوتا ہے۔۔۔“

کھور نے خوش ہو کر کہا، دسر کار آپ جس وقت بھی بلائیے ہم ہر وقت حاضر ہیں، اگر وقت پر نہ آویں تو ایک مہینہ نہ دیکھتے گا سرکار! اب بڑی دیا لو ہیں۔۔۔۔۔“

”دکھو! تم بہت بڑھ گئے ہو، کشور کا سپ کیا کر پھر کوئی چوک
تو نہیں ہوئی اس سے — لیکن پرہیزگار لکھنوی لڑکی جس جیسے
ہو ا کے لطیف جھوٹوں کوں سے دکھو، اپنی بچکر یاں کھرا دیں، اس نے
کہا، ”دیکھو کشور! تم امیر نہیں، رو پئے و لے میں تو اس سے کیا ہوا،
تم غریب ہو لیکن میں سمجھتی ہوں کہ تم شریف ہو — تم مجھے میرے
نام سے پکار سکتے ہو، یہ سرکار و رکا رتو — آخر تم نے میرا نام
پوچھا ہے کس لئے — تم کو میرا نام لیکر پکارنا ہی ہو گا —
زیادہ بڑے بڑے الفاظ سننے سے انسان مغرور سا ہو جاتا ہے۔
سمجھے؟“

”نہیں شریعتی حی! آخر عذیب اور امیر میں کچھ فرق بھی تو ہونا چاہئے، میری ہمت نہیں پڑتی کہ میں اور آپ کا نام لے سکوں!! اور نام تو صرف یونہی میں لے بوجھ لیا تھا۔۔۔“

” لیکن — آپ — “

”نہیں۔ آپ نہیں بلکہ تم۔“ — فرط مسرت سے کشوریہ ہونٹ کھلے کھلے رہ گئے اور اس نے اثبات میں اپنی گردن کو جھنجھکی یعنی وہ بھی پرمیلا کو ایسا ہی تصور کیا کرتا تھا کہ وہ امیر و عزیز کی کوئی تفریق نہیں کرنا چاہتی اور اس کی وقعت کشور کے دل میں اور بڑھتی تھی۔ — پرمیلا بھی کی ضد کی بنا پر اگر کہ اس کا نام بھی اپنا تھا تو بڑے احترام سے۔ — اسے پرمیلا کے یہاں دوسرے واپے ماہو اور مقرر ہو گئے تھے۔ اب اسے مالک کا بھڑا پورا کر کے کھلے صرف غنڈری سی محنت اور کرنی پڑتی تھی۔ لیکن کشور کا پہلا زخم ابھی اچھی طرح بھرا بھی نہیں تھا کہ پرمیلا کے ان الفاظ نے اسے چہرے پر کر دیا۔ ”ستھتے ہو کشور اسلے سے ہمیں اسکول نہیں آنا ہوگا۔“

”دیکھو؟ — کیا بات ہوئی پرمیلا دلوی؟“ —

”کچھ نہیں۔ کل سے ہمیں کالج کبھی نہیں آنا ہو گا۔ اچھا تم کل آؤ گے نا؟“ — کشور ہنکا رہا گیا۔ اسکی سمجھ میں کچھ نہ آیا، لیکن اس نے پر میلے کے آخری الفاظ کو سنا۔ اور اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”ہاں ہاں ہم کل کیوں نہیں آئیں گے، ہم ضرور آئیں گے، ہم تو آتے ہی ہیں پر پر میلہ دہری ہم سے کسی روز دیر تو نہیں ہوئی، آپ ہم سے خفا کیوں ہو گئیں؟“

”سنو! کل پھر تم آجانا،“

”کل کے بعد پھر پرمیلا دیوی؟“

”بھڑکیا۔۔۔؟“ ایسا معلوم ہوا جیسے کشور کے آگن میں چند مان پھٹ پڑا ہے، اس نے رات نہایت اضطراب میں کاٹی اسے
 ہر چیز ادا اس، سوئی سوئی، اور رومی رومی معلوم ہوتی تھی سوچ
 رہا تھا، آج یرمیلاد دیوی اتنی ادا اس رومی رومی کیوں تھیں۔
 ”۔۔۔؟“ پوچھتے ہی کشور جو رنگ بڑھ گیا، دربان نے یرمیلاد دیوی
 کو لاجر خبر کی، ”دراپ کار کشا والا آگیا ہے چھوٹی سرکار“،

دن در بان محی کبسا احمق ہے، میرا رکت والا ہے،
دن جہان فی سستہ ہے

پر میلہ باہر نہیں آئی بلکہ اس کے پتا جی آئے اور انھوں نے پوچھا، تمہارا کتنا حساب ہوا رکش و لالہ؟

» خیر تو ہے سرکار، ہم سے کوئی غلطی تو نہیں ہوئی، پھر ایسا کیوں؟« — پر میلہ کے پتے کے جواب دیا کہ، »دہنیشور پر میلہ نے کالج چھوڑ دیا ہے، تم اپنا حساب لے لو،« — کشور نے کچھ جواب نہیں دیا، سکتے میں رہ گیا، اس کا داغ بری طرح گھوم ہاٹا اس نے بڑی ہمت سے کام لیکر پوچھا، »دیکھو سرکار! پر میلہ دیوی اب نہیں پڑھیں گی؟« — سوریش بابو نے ہنستے ہوئے کہا، »دہنیشور پر میلہ کا بیاہ ہے نا، تمہیں بھی کچھ کام کاج کرنے کوکل سے آنا ہوگا، مطمئن رہو تمہیں پوری مزدوری ملجا کرے گی،« — کشور نے ایک کھپائی ہنسی ہنستے ہوئے جواب دیا، »بڑی اچھی بات ہوئی! بڑی اچھی بات!! ہم بہت خوش ہیں سرکار« — کل سے ہم ضرور آئیں گے،» —

کشور — مذہب حال اس گھوڑے کی مانند جسے چایک سوار نے بے قصور سینکڑوں کوڑے لگا کر اس کے جسم کو گھائل کر دیا ہو، ڈنگ لگاتا ہوا چلا، اس کا داغ ان باتوں کی آماج گاہ بنا ہوا ہوا تھا جو پر میلہ نے اس سے کہی تھیں دو ہم امیر ہیں، روپے والے ہیں تو اس سے کیا ہوا، تم کو مجھے پر میلہ ہی کہنا ہوگا،» — وہ سوچ رہا تھا کہ اب اسے کشور کہہ کر کون پکارے گا اور کس سے وہ باتیں کرے گا، اور کس کو پر میلہ دیوی کہے گا۔

کشور انہیں خیالوں سے اٹھتا ہوا بڑھتا گیا، اسکے رکشا پر آج پر میلہ دیوی نہیں تھی، سب سے پہلے صبح ہوتے ہی اسکے رکشا پر پر میلہ رہتی تھی، یہ روز اپنی دیوی کا دشمن کیا کرتا تھا، آج اس کا رکشا خالی تھا، جیسے اس کے کچھ پرسانپ لوٹ رہا ہو — وہ گرلس اسکول کی طرف آنکلا، بالکل غیر ارادی طور پر — اسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے بی، ان، آر، ٹریننگ کالج کا بڑا پھانک ایک میب دیو ہے اور اسے پکڑنے کیلئے بڑھا آ رہا ہے — وہ فوراً پٹا — اس نے کہا، »جب پر میلہ ہی نہیں چڑھیں گی تو پھر کس کا منہ ہے میرے رکشا پر چڑھنے کا، اس نے رکشا بجا کر مالک کے حوالہ کر دیا — ایک مرتبہ

وہ پر میلہ کو دیکھتا چاہتا تھا، وہ سوچتا تھا پر میلہ نے اسے بتلا کیوں نہیں دیا کہ اس کی شادی ہوئی یا نہیں ہے، اس میں اس کا کیا بگڑ جاتا ہے پھر یہ بھی سوچتا کہ آخروہ تیلانی ہی کیوں — میں ہوتا ہی کون ہوں گا؟ — کشور کا دل بھرا آیا، خیال میں کھو یا ہوا، وہ پر میلہ کی کوٹھی پر پہنچا سوریش بابو نے کہا، »دہنیشور آج یہ بیٹھک صاف کر دو اور کل پر میلہ کا کمرہ صاف کر دینا،« — پر میلہ کا نام سن کر اور آخری بار اپنی مقدس دیوی کی خدمت کرنے کا موقع پا کر کشور کے بڑمردہ آنکھوں میں ایک ہلکی سی مسرت کی چمک جاگ اٹھی — اس نے بڑی تندہی سے کام کیا اور کام ختم کرنے کے بعد بازار آیا — پہلے تو اسے پیسوں کی بالکل ضرورت نہیں رہتی تھی لیکن اب تو نہ معلوم کیوں اسے صرف پیسوں کے حاصل کرنے ہی کی فکر رہتی، سوائے پیسوں کے اسے اور کچھ نہیں بھانا، اس نے بوجھ ڈھونڈنا شروع کر دیا، وہ مزدوری کرتا اور صرف غنچوڑا بہت روکھا پھیکا کھا کتنا پیسوں کو بچا کر رکھ لیتا — لوگ اسے دیکھتے اور تعجب کرتے تھے کہ شاید اس کا داغی نواز بگڑ گیا ہے — اتنا اچھا جوان گھل کر کاٹا ہو گیا، اس پر کونسی مصیبت آن پڑی ہے — ہر صبح کشور سوریش بابو کے یہاں جاتا اور کام ختم کرنے کے بعد مزدوری کرنے کیلئے بازار چلا جاتا، ایک روز سوریش بابو نے کہا، »دہنیشور! سنئے ہو، پرسوں پر میلہ کی بارات آئی ہوگی ہے، تم سویرے ہی سے چلے آنا، باراتیوں کا سامان وغیرہ تمہیں اتارنا ہوگا،«

» بارات! پر میلہ دیوی کی بارات!! — پرسوں ہیں؟ — اُن جگہ لوگ — «

کشور پھر بازار چلا آیا، پاگلوں کی طرح یہ ہر آنسوئے جانے والے سے پوچھتا، »دو بوجھابے سرکار؟ سستا ہی پہنچا دوں گا،« لوگ اس کا منہ تنگے ہوئے بڑھ جاتے اور وہ ناپوس ہو جاتا — سبوں کو یقین سا ہو چلا تھا کہ کشور پاگل ہو گیا ہے — بعض لوگ جو اس کے گزشتہ دکھ درد کی کہانی جانتے تھے دوسروں سے دوہراتے اور پھر وہ انہیں کہتے، »جس پر اتنی مصیبتیں پڑی ہوں، جو اتنے غمناک تعلق رکھتا ہو، بڑھا لکھا ہو، جس پر چنانچہ مصیبتوں کا سہارا ٹوٹ پڑا وہ

پاگل ہو گا تو کیا ہو گا، جب تک بدن میں خوب کس ل ہا رکشا کھینچا لیکن اتنی کوئی صف
میں پتی ہوئی شکر پر رکشا کھینچنا کوئی معمولی بات نہیں ہے، دماغ گرم تو یقینی
ہو گا۔ ا۔، کشور پریشان حال آبادی سے دور ایک ویران مقام پہنچا گیا،
کمرے سے ایک میلا کچلا چائی دار ٹوٹا نکالا، بیسوں، صدیوں، اکنیس سھول کو
گنتا شروع کیا "تیرہ روپے ساڑھے چار آئے، ایک دھندلی سی خوشی اس کے
چہرہ کو مس کر گئی، وہ جہر باز آ یا، ایک سنار کی دکان پر پہنچا، سب بیسوں کو
جو اس کی زندگی بھر کی کائنات تھی بکھوڑ دیا اور کہا، "بابو جی! اسے گن بیچنے اور مجھے
ایک بڑھیا سوئے کی انگوٹھی دینے اگر کچھ گئے گا تو تم کمر آپ کا چکا دیں گے
بابو جی، ہم نہیں پرتو رہتے ہیں، آپ ملن رہتے رہو۔۔۔" کشور
کی سر اسٹیک، اس کی اتنی شستہ زبان اور یہ زبوں حالی سنار کو متعجب کرنے
کیلئے بہت کافی تھی، جہاں اُس نے ایک انگوٹھی نکال کر دیدی۔ کشور
نے انگوٹھی کو بڑی احتیاط سے کمر میں بٹے کے اندر رکھا۔۔۔ صبح ہوئی
پر میلانی کوٹھی پر پہنچا، پر میلہ اچھی سو کر اٹھی تھی، اس کا چہرہ خزاں کے
سفید گلاب کی طرح اتر اتر اتر ہوا تھا۔ کشور کی ہاتھیں کھل گئیں۔۔۔ پر میلہ
نے بھی کشور کو دیکھا اور غصہ کھ گئی، کشور نے بڑبڑہ لب و لہجہ میں کہا۔۔۔
"ابھی بہت سو رہا ہے ناپر میلہ دیوی؟ بابو جی نے سویرے ہی بلا یا تھا،
آج تمام مردوں کو صاف کرنا ہے، پر میلہ کشور کو کتنی رہی، چپ چاپ سی
بھرا س نے کہا، تم اب رکشا نہیں چلائے کشور؟ کشور ناموش رہا،
دھوٹے موٹے آنسو اس کی ہلکوں میں، بھر کے اور ڈھلک گئے، نہ معلوم
کیوں پر میلہ کی ہلکی ہلکی بوجھیں کچھ بوجھیں کشور نے کہا پر میلہ دیوی اگر
بھری ہو گیا، پر میلہ اس کے بالکل قریب ہو گئی، ہمدردانہ و سرگوشیا زانو
میں اُس نے پوچھا، کیا ہے کشور؟ تم کتنا کیا چاہتے تھے؟۔۔۔
پر میلہ دیوی تم بیچ بچ کی دیوی ہو، ایک بات جو مان لو لپٹے
غریب اور پرانے خدمت گزار کی۔۔۔"

"دھوٹے کیوں نہیں کشور؟ آخر مطلب کیا ہے تمہارا؟۔۔۔
"غریب کا آپ سے کیا مطلب دیوی جی؟ صرف یہ نشانی۔۔۔
اگر قبول کر لیں اسے تو میں سمجھوں گا۔۔۔ نہیں میں بہت ہی خوش
ہوں گا سرکار۔۔۔" پر میلہ کشور کو اچھی طرح سمجھا ناچا ہتی تھی

لیکن وہ جذبات پر قابو نہ پاسکی۔ اس نے صرف اتنا کہا، "کشور! تم نے
روپیہ فضول بریا کیا۔۔۔ تم غریب ہو اور غریب کی نشانی ہی کیا؟
غریب تو خوش رہتے کیلئے نہیں پیدا کیا گیا۔۔۔ اور پھر آجکل تو تم رکشا
جی نہیں کھینچتے،۔۔۔ یہ کیسے کہتے وہ بہت زور و دھم سسکیا
بیتی ہوئی اپنے کمرہ میں چلی آئی، استنہ میں سوریش بابو بھی آئے، انہوں
نے کشور کو دیکھتے ہی خوش ہو کر کہا، واہ کشور! خوب تم آگئے اجاؤ
پر میلہ! اپنے کمرہ میں ہے، آج اسی کا کمرہ تمہیں صاف کرنا ہے۔۔۔
کشور کمرہ میں چلا نوا لیکن ایک بے جان، بے حس مجسمہ کی مانند کھڑا رہا
وہ انگوٹھی اپنی مٹھی میں بھینچے ہوئے تھا، پر میلہ نے مڑ کر اس پر ایک
نگاہ ڈالی اور بولی، "ہاں تو تم میرا کمرہ صاف کر لے آئے ہونا؟ اچھا
دیکھو یہ لیستر باہر کمرہ اور دیو گھڑی مینز کے اندر رکھ دو، اور ہاں دیکھو
اسے مت چھونا یہ بجلی کا تار ہے، لیگ کرنا ہے، بابو جی نے کہا ہے
مسٹری بلو اگر اسے ٹھیک کرنا ہو گا،۔۔۔" پر میلہ چلی گئی،
کشور جلدی جلدی کمرہ صاف کرنے لگا، وہ کمرہ صاف کرنا تھا اور
سوچتا تھا، ہم امیر ہوئے، روپے والے ہوئے تو کیا ہوا؟
تمہیں مجھے پر میلہ کہتا ہی ہو گا، پھر اس کے دماغ نے ایک پلٹا
اور کھایا اور وہ سوچنے لگا، تم غریب ہو اور غریب کی نشانی
ہی کیا؟ صرف یہ انگوٹھی!، اس کے دماغ نے ایک پلٹا اوکھایا
"اسے مت چھونا یہ بجلی کا تار ہے،۔۔۔" کشور پگلاؤں
کی طرح زور سے ہنسا اور چھپ کر اس نے تار کو پکڑ لیا
ایک ہلکی خیف چیخ کمرہ میں گونج کر رہ گئی۔

پر میلہ کے پائیں باغ میں ایک حقیر
بیل ناشپاتی کے درخت کا سہارا پا کر بہت دور تک چڑھ گئی
حق۔۔۔ شدنی! ہوا کے ایک تیز جھٹکنے
آج اسے پھر زمین پر گرا دیا۔۔۔ سامنے سے
ایک بکری آئی اور اسے چر گئی۔۔۔
کشور کی جو کہاں بن تاتی حرفوں میں لکھی نظر آتی تھی وہ بھی اسکی
زندگی کے ساتھ ختم ہو گئی۔

عجیبات

چند روز ہوئے، اپنے ایک مغربی حصہ کے قیام کے دوران میں، کیونکہ میں کبھی آج تک اس طرف نہ آیا تھا وہیں سیر کے لئے نکل گیا۔
 مارچ کی ششدرمی صبح تھی!

میں ایک ایسے خلیجیان میں تھا جو اکثر آدمیوں کو ہوا کرتا ہے خالی الذہن، خود اعتمادی مفقود، ہزاروں قسم کی انجینیں گھیرے ہوئے کتنی تکلیف دہ ہے قلم کے سہارے بیٹھے والوں کی زندگی بھی۔ ایک جھڈو ایک کوشش اور بقول میرے ایک دوست کے ایک مردانہ وار کوشش! ہاں تو میں اس وقت ہی سوچ رہا تھا۔ ہوا کی نرم لہریں رگ و پے میں ایک زندگی پھونک رہی تھیں، ایک چمکدار سورج نیلگو آسمان کی سطح پر تیر رہا تھا مگر میرا ذہن ابھی تک اسی طرح بیکار تھا روشنی کی ایک شعاع بھی میرے دماغ تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ نہ معلوم وہ ہلکے رنگ کے تیرتے ہوئے قمری سائے جو دماغوں کو کام کرنے پر ابھارتے ہیں اس وقت کہاں غائب ہو گئے تھے۔ نہ معلوم وہ نور مئی قوتیں جو روح میں احساس اور گرمی پیدا کرتی ہیں اس وقت کہاں سو گئی تھیں اور میں انکا کر اپنے پیشہ کو گالیاں دینے لگا۔

میری نگاہیں پہاڑی سلسلہ کے تنہیب و فراز میں بٹک رہیں تھیں، جھنگل، یہ وادیاں، یہ حسین چٹانیں اور یہ ایک قوس و قزح کا حلقہ مجھے بے چین کر رہا تھا کہ میں اس حسن، اس خوبصورتی اور اس دلکشی کو اپنے الفاظ میں محصور نہیں کر سکتا۔ اونچی نیچی بل کھاتی ہوئی روشنیوں کو تراش کر ہموار کر دیا گیا تھا اور ان کے پیچھے ہر چیز نہایت صاف نظر آرہی تھی۔ لہذا ایک میری نگاہوں کے سامنے کچھ بیلے سے ناچنے لگے کچھ سیاہ و سپید چیزیں ہوا میں متحرک معلوم ہوئیں، ایک، دو تیں، تلبتر کوں کا ایک جھلڑ ہوا میں اڑتا ہوا جا رہا تھا، حسین پرندے

اپنے طول طویل سفر پر گنگنا تے ہوئے روانہ ہو رہے تھے اور بخوڑی ہوا پر میں وادیوں اور جنگلوں کو پار کر کے ان کے پیچھے غائب ہو گئے لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اپنے پیچھے کچھ چھوڑ گئے ہیں۔ خیالات کروٹیں سی لگے تھے، مایوسی میں دبی ہوئی ایک امید پھر اُٹھرائی تھی اور اس وقت یہ جی چاہا کہ اپنے آپ کو اپنی وادیوں کی رنگینیوں کے حوالہ کر دوں۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ دوسری پگڑندی کے موڑ پر تے گر جا کی گھنٹیوں کی جھو جھری آواز میں سنانی دینے لگیں۔ کوئی تین سو قدم کے فاصلہ پر ایک بستی نظر آرہی تھی۔ آدمیوں کے گرد وہ خوبصورت لباس پہنے ہوئے اور عورتیں نرم و نازک لباسوں میں ملبوس آپس میں باتیں کر رہے تھے اور گرجا ۵۹ کے مربع صحن کے اوپر ایک چمکدار کلسن سکرا رہا تھا۔

”کیا بات ہے، میں نے سوچا۔ آج اتوار بھی نہیں کسی امیر نیک کی سالگرہ بھی نہیں معلوم ہوتی اور کسی پیر کا عرس بھی نہیں اور عرس ان علاقوں میں اس طرح منائے بھی نہیں جاتے، پھر کیا بات ہے، یقیناً کسی کی شادی ہے۔ اور میں دیکھنے کیلئے اس منتظر گرد وہاں سے گزرتا اور الجھتا ہوا اندر تک پہنچ گیا۔ وہاں بھی لوگوں کی بھیڑ بھاڑ تھی اور سب دروازہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جھڑوں کے چھتے کی طرح جھن جھن ہو رہی تھی۔ گرجا اسی طرح جس طرح وہ آج سے برسوں پہلے دکھائی تھا خاموش اور ساکت تھا، اس کی دیواریں اور بھاری بھاری پتھر دیہاتی عبادت گزاروں کا تماشہ دیکھ رہے تھے لیکن اتنی بات ضرور سمجھ کر آج یہاں مغربی سے زیادہ رونق تھی اور ہوا میں لوگوں کے کپڑوں کی خوشبو میں اڑ رہی تھیں۔

گھنٹیاں جو اب تک ایک متر متر آواز میں آہستہ آہستہ بک رہی تھیں ایشیا جون جولائی ۱۹۲۷ء

اور ایک خاص قسم کا کیف و سرور پیدا کر رہی تھیں اب زور زور سے
 بجھنے لگیں۔ ان کی اس وقت کی بے ہنگم چیخ سے ایسا معلوم ہوتا تھا
 جیسے دہن بہت قریب آگئی ہے اور بس یہاں پہنچنے ہی والی ہے میری
 لگا ہوں کے سامنے ایک نوجوان کھڑا تھا جو ابھی ابھی لو کہن کی حدود
 سے نکل رہا تھا۔ ان کے گرد لوگوں کے حلقہ دستا نے چڑھے ہوئے
 ہاتھوں اور اس کے کھیلنے ہوئے چہرے پر ایک خاص قسم کی ہنسی
 معلوم ہو رہا تھا کہ یہی دو لہا ہے۔ مجھے وہ اس وقت نہایت بھلا
 معلوم رہا تھا۔ وہی معمولی دیہاتی تراس خراش، فطرت میں ایک
 بیباکی اور آزادی اور لگا ہوں میں ایک امنگ لیکن کوئی خاص طور
 پر اس کی طرف توجہ نہیں دے رہا تھا۔ سب لوگ دہن کا انتظار
 کر رہے تھے، اور سب لوگوں کے ساتھ مجھے بھی بے چینی ہونے لگی۔
 کیسی ہوگی وہ؟ ایک معمولی قسم کی دیہاتی لڑکی۔ بھرے
 بھرے گلے، بھر در اس نقاب، بھوراسار رنگ اور خرگوش کی آنکھیں
 یا پھر کچھ..... کچھ اس لڑکی جیسی مجھے میں نے ایک مرتبہ ویز
 میں دیکھا تھا اور اس کے بعد سے آج تک اس جیسی نظر سے نہ گذری
 میں نے ذرا آگے کو جھلک کر ایک عورت سے جس کا چہرہ سیب کی طرح
 گول اور پکا ہوا تھا پوچھا، ”کیا آپ بتا سکتی ہیں ان میں دہن
 کونسی ہے؟“

۶۰

اس نے مجھے اپنی گول گول، بھوری اور اجنبی لگا ہوں سے
 گھورتے ہوئے جواب دیا، ”دیکھو! تم نہیں جانتے، یہ مادانہ، اس
 علاقہ میں سب سے خوبصورت لڑکی،“ اور پھر اس نے اپنا انگوٹھا
 چماتے ہوئے دو لہا کی طرف اشارہ کر کے مجھے سب نے نظر انداز کر رکھا
 تھا کہادر بڑا خوش قسمت ہے یہ جو اسے ایسی حسین لڑکی اور ابھی
 لڑکی ملی، ”گراس کی اس تشریح سے میری کچھ تسلی نہ ہوئی۔

ایک شور، ایک حرکت، ایک بے چینی!
 اور لوگوں کی طرح میں بھی بلا تکلف گم گیا۔ وہ ایک بدشت
 خانہ بدوش لڑکی کے سہارے سہارے اپنے بہترین دیہاتی لباس
 میں آ رہی تھی۔

میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اس ٹیپاے گر جا کے صحن پر

ان سیاہ پوش آدمیوں کے درمیان وہ ایسی معلوم ہو رہی تھی جیسے
 کوئی سورج کی کرن ناز رہی ہو۔ میں نے اتنا مسرت انگیز سہانا
 اور دلکش چہرہ آج تک نہیں دیکھا۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ اسکے لبوں پر
 کھیل رہی تھی، ایک شوخی اس کی نگاہوں میں رقص کر رہی تھی اور
 وہ اپنے ماحول کی دلچسپیوں میں جذب ہوئی جارہی تھی، اس کے
 سرکش اور سنہرے بال موٹے سے نقاب میں مچل رہے تھے، اُس کی
 پتلیاں مست کھونروں کی طرح رقصاں تھیں۔ اسے دیکھ کر ایسا محسوس
 ہوتا تھا جیسے کسی نوعمر بچے کھیلوں پر سورج کی کرنیں ناز رہی ہیں۔
 مچل رہی ہیں۔ اس کے چہرے پر ایک خاص چمک تھی جو انسان کی نیک
 فطرت کی انتہائیوں سے ابھرتی ہیں۔ مجھے اس کا چہرہ دیکھ کر اور یہ
 معلوم کر کے کہ وہ اچھے ہاتھوں میں جارہی ہے ایک سکون سا ہو گیا۔
 گر جا کے صحن میں نرگس کے پھول اُگے ہوئے تھے جو اس
 لڑکی کی شادی پر عین موزوں تحفہ تھا۔ جب وہ باہر نکلتی تو ان پھولوں
 میں لدی ہوئی تھی اور ایک ایسا تکلیف دہ اعتراف جس کے بغیر
 معصوم سے معصوم روح بھی خوشی کی حدود کو نہیں پہنچ سکتی
 اسکے چہرے سے نمایاں تھا۔ دنیا میں ایسی چیزیں بھی ہیں جنہیں
 دیکھ کر آدمی ایک گونہ اطمینان محسوس کرتا ہے، سورج کی روشنی
 ، پھول، کیلئے ہوئے تندرست بچے، خوش السمان پرندے، بالبال
 پہاڑ، نیلگوں آسمان، رقص اور نوجوان لڑکی کا چہرہ اور اس وقت
 مجھے بھی یہی احساس ہوا کہ سب لوگ اسکے چہرے کو دیکھ کر ایک گونہ
 خوشی محسوس کر رہے تھے!

وہ جا چکی تھی اور ایک خاموشی، سکون اور تنہائی اپنے پیچھے
 چھوڑ گئی تھی۔ میرے آگے آگے ایک لنگڑا بوڑھا اپنے رخساروں پر
 اگی ہوئی گھٹی ڈاڑھی میں انگلیاں پھیرتا ہوا در مسکراتی ہوئی لگا ہوا
 سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا چل رہا تھا۔ میرے چہرے پر بھی ایک ہلکی سی
 مسکراہٹ دیکھ کر اس نے کہا۔ ”دیکھا تم طریقہ ہے! جب ایسی لڑکیاں
 بھی شادی کے بعد چلی جاتی ہیں تو روح لرز جاتی ہے،“ میرے سر پر لٹا پڑ
 اس نے پھر کہا، ”یہ سورج کی نرم اور جہ پا کرش اب یہاں کبھی
 نہیں آئیں گی، بھوت نہیں، اب یہاں ایسی لڑکی نہیں مل سکتی!!“

ایشیا جون، جولائی ۱۹۷۷ء

میں گفتگو کیلئے کوئی موضوع تلاش کرنا چاہتا تھا، میں نے کہا،
دیکھا وہ اس کا باپ تھا،

اس نے تیز تیز نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے زور سے
گردن جھٹکی، نہ اس کی ماں ہے نہ باپ، یہاں ماں کا کیا کہتے ہیں
اُسے چچا کہتا ہے، ماں باپ نہیں اس کے، اس نے فقرہ کو دہرایا، ابھی
آواز کے ٹھہراؤ میں ایک تکلیف کا احساس تھا، ایک کھر کھراہن جیسے
وہ کچھ جانتا ہے اور بتانا نہیں چاہتا۔

کیونکہ اب انتظار کے قابل کوئی چیز نہیں رہی تھی اس لئے میں
اوپر کی پگڈنڈی پر ایک چھوٹی سی سرائے میں چلا گیا اور دوٹی اوپنیر
لائے کیلئے کہا۔ اندر کے کمروں میں بہت سے آدمی کھانے پینے اور
شور کرنے میں مصروف تھے اس لئے میں ایک اجنبی کی حیثیت سے باہر
برآمدہ ہی میں بیٹھ گیا اور وہیں مارچ کے سورج کی نرم شعاعوں
میں اپنا معمولی سا ناشتہ ختم کیا، پیسے دیئے اور جلد بائیس برس
ساتھ تین چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کے نشیب و فراز
کو دیکھ کر میں ہوں ہی بے جا بوجھے ایک بر مولیا، دراصل یہاں
کی تفریح یہی ہے کہ بلا جاسے بوجھے کہیں سے روانہ ہو گئے اور کہیں
جان لگے۔ اس پگڈنڈی پر کل دو چیزیں نظر آئیں ایک چھوٹی سی آناؤ
اور ایک کھیت چڑھان پر اور تمام راستہ میں کچھ نہ تھا۔ بہار
ابھی ان علاقوں میں اچھی طرح اجاگر نہ ہوئی تھی کہیں کہیں نیتوں
پر کلیاں نظر آ جاتی تھیں اور کبھی کبھی سورج کی روشنی میں ہوا کے
کندھوں پر برف کے ٹکڑے اڑتے ہوئے دکھائی دے جاتے تھے۔
دوسری طرف دیوار کے ایک کچ کے پاس پگڈنڈی ایک مکان کے
صحن میں ڈوبی ہوئی دکھائی دے رہی تھی جہاں تین چھکڑے کھرے
تھے جن کا رخ آسمان کی طرف تھا۔ پگڈنڈی پر زنگس کے پھول بکھرے
پڑے تھے اور مکان سے شور بلند ہو رہا تھا۔ لوگوں کی آ جارا اور
جھنجھٹ سے مجھے اچانک محسوس ہوا کہ میں اتفاق سے دہن کے
مکان پر پہنچ گیا ہوں۔

میں نے اپنی حیرانی کو دیا تے ہوئے خشک پتھر پی زمین،
کبوتروں، مرغیوں اور کتوں کے شور اور پرانے ڈھیر نما مکان کی

بوالعجبی پر ایک نظر ڈالی اور ایک داییں ہاتھ کی پگڈنڈی پر چوبیس
نڈی کے پاس سے ہو کر گزرتی تھی مڑ گیا۔ میرے داییں ہاتھ پر ایک
بہت بڑا پڑا درخت کھرا تھا اور بائیں ہاتھ پر ایک اجڑا سا میدان
پڑا تھا جس میں بہت سے درخت اُگے ہوئے تھے پگڈنڈی نیچے
ایک مکان کے دروازہ پر جا کر ختم ہو جاتی تھی جہاں پتھروں کی ایک
چٹان سی بنی ہوئی تھی۔ کئے ہوئے کھیت خزان کی یاد دلا سکتے
اور کھیتوں کی بارشیں بے ترتیبی کے ساتھ اکھڑی پڑتی تھیں۔ لہو
کی آمیزش لئے ہوئے چھوٹے چھوٹے شزارے اور نیلا دھواں زرد
زرد نیم وا کلیاں، سورج کی کرنیں اور کچھ اُٹنے ہوئے برف کے
ٹکڑے ہوا میں ایک عجیب قسم کی رنگت پھیلا رہے تھے میں ہاں
پہنچ کر رکا اور سوچنے لگا آیا مجھے نیچے جانا چاہئے یا نہیں؟
آخر کار میں نے ارادہ کر لیا کہ ضرور نیچے جاؤں گا اور

اس خیال سے دروازہ کو دھکیلتا شروع کیا، اچانک میری نظر
ایک عورت پر پڑی جو درخت سے ورے دیوار کے سایہ میں ایک
پتھر پر بیٹھی ہوئی تھی اس نے اپنا سر دوڑوں ہاتھوں میں دبا رکھا تھا، اسکی
آنکھیں بند تھیں اور وہ اپنے بدن کو آگے پیچھے جھلا رہی تھی اس ۶۱
ابھی مجھے نہیں دیکھا تھا، نیلی سرخ کا لباس اس کے بدن پر غصہ
ہیٹ اسکے قریب زمین پر پڑا ہوا تھا اور اس کے سیاہ بال
رخساروں پر پھیلے ہوئے تھے۔ وہ چہرہ جس پر کرنیں سی منڈلا رہی
تھیں ایک دم بعبیاناک اور حماقت انگیز معلوم ہوئے نگاہ جو
چہرہ کبھی حسین رہ چکا تھا اب زندگی اور تیز احساسات کے ہاتھوں
کھر در اور متورم ہو گیا تھا۔ اب اسکی طرف دیکھنے سے لمبی تکلیف
ہوتی تھی۔ اس کا لباس، اس کا ہیٹ اور جس طریقہ پر اسکے بال
بنے ہوئے تھے ان میں شہری تہذیب کی جھلک تھی۔ اس میں ایک
ایسی بے نام سی چیز جھلک رہی تھی جو صرف ان عورتوں میں ہوتی
ہے جن کا کام مردوں کو بہانہ ہے، لیکن اتنے پر بھی اسکی نظروں
میں ایک حیرانی تھی جیسے وہ شہر میں بہت کم رہی ہو۔

یہ حسن ماحول، ایک عورت، آزدہ خاطر اور اپنی پریشانیاں
پر قابو پانے کے ناقابل۔ کون ہے جو اس منظر کو دیکھ کر اتنا تہنوکا
ایشیا جون۔ جولا فی سلسلہ

بھی کیا کیا سکتی ہے؟ میری زندگی کا مقولہ ”خوش باش رہے گا ہے“
مگر اب تو میں اپنے حقد کا سب کچھ ختم کر چکی ہوں اور اس کا باپ....
اس کا باپ بھی مر چکا ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ محض اس لڑکی کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا؟“
”چاہو تو یوں بھی کہہ سکتے ہو۔ اس لڑکی نے مجھے اور اسے
ایک دوسرے سے دور کر دیا۔ مجھے کہا کیا کہیں سپر دعویٰ دائر
کر دوں۔ وہ روپیہ ادا نہیں کر سکتا تھا اس لئے وہ چلا گیا۔ اور
دو سال بعد جنگ ہو کر میں مارا گیا اور میں، میں بھی لیکن وہ
ابھی تک ایک دلکش خیال کی طرح حسین اور زندہ ہے۔ کتنی عجیب
بات ہے، کیوں؟ اور پھر وہ اسی طرح خلا میں گھور رہی۔“

مجھے بھی کچھ کہنے کیلئے الفاظ نہ ملے اور میں سوچنے لگا، سورج
کی ایک حسین اور رقصاں کرن جس کا وجود یہاں والوں کیلئے ایک
رحمت تھا۔ جس کے بارے میں لوگ کہتے ہیں ”اب ایسی لڑکی یہاں
نہیں مل سکتی، اس کے وجود نے دو ہستیوں کو تباہ کر دیا، ان دو
ہستیوں کو جنہوں نے اسے جنم دیا تھا۔“

اس نے پھر کتنا شروع کیا وہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ
مجھے کیونکر معلوم ہوا اس کی شادی چوتھائی ہے۔ ایک کسان
مجھے بتایا تھا۔ وہ جب بھی شہر آتا ہے میرے پاس ضرور آ کر ٹہرتا ہے۔
مجھے ابھی طرح معلوم ہے کہ وہ میرے پرانے مکان کے پاس ہاگڑا تھا
لیکن وہ مجھے نہیں جانتا حالانکہ وہ میرے ساتھ سکول جایا کرتا تھا۔
میں نے بھی اسے کبھی نہیں بتایا۔ اس روز جب اس نے مجھے شادی
کے بارے میں بتایا میرے اوپر عجیب مضحکہ انگیز قسم کے جذبات طاری
ہوئے، اس نے ایک عجیب انداز میں سر ہلایا وہ میں نے اپنی زندگی کے
حالات کبھی کسی کو نہیں بتائے مگر معلوم نہیں میں نے نہیں کیوں بتائے
آج میں اپنے حواس میں نہیں ہوں، اس کے اس فقرہ پر میرے جلدی
سے کہا ”کوئی ہرج نہیں میں یہاں کسی ایک آدمی سے بھی واقف نہیں“

اس نے ایک آہ بھری، ”بڑی تکلیف کی آپ نے، میرا بھی
کبھی کسی سے باتیں کرنے کو مجھے چاہئے لگتا ہے، وہاں تو اس کسان
کے چلنے جانے کے بعد میں نے سوچا کہ ایک دن کی چھٹی مناؤں اور اپنی

لڑکی کی شادی ہوتی ہوئی دیکھوں، وہ ہنسنے لگی، ”میری رنگینیاں
سب کی سب اس رات کو ختم ہو گئی تھیں جس رات مجھ پر وہ جنون
سوار ہوا تھا۔ آہ!“

میرا باپ بہت سخت گیر آدمی تھا۔ اس کے چلے جانے کے بعد
میرے باپ نے مجھے شادی نہ کرنے دی۔ سوتیلی ماں کے پاس رہ کر
میری زندگی میں روناد داخل ہو گیا۔ میں بہت نرم دل تھی۔ سوتیلی
بھی میری آنکھوں سے آنسو بہتے رہتے تھے، وہ ہمیشہ بھیگی ہی رہیں،
ایک نوجوان لڑکی اور آنسو میرے باپ نے مجھے شادی نہ کرنے دی،
”تو کیا تم بھاگ گئیں اس کے بعد؟ میں نے آہستہ سے کہا۔

”سب سے بڑی جرأت کا کام جو میں نے ساری زندگی میں
کیا۔ بچی کو چھوڑتے وقت میرا جی لگتا تھا۔ لیکن اس کے سوا دوسرا
علاج خود کشی تھا۔ میں ایک نوجوان جلد ساز کے ساتھ بھاگ گئی جو میرے
لئے دیوانہ تھا مگر اس نے مجھے شادی نہ کی، وہ پھر ہنسنے لگی
اور جلتی ہوئی گھاس کی طرف اشارہ کر کے گہا ”جب میں چوٹی سی تھی
تو اس کی گھاس جلانے میں مدد کیا کرتی تھی، اور وہ پھر رونے لگی
مگر اس مرتبہ یہ اتنا تکلیف دہ تھا

۲۳

گاڑیوں کے راستے سے ہٹ کر ایک پرانا جوتا پڑا تھا میں نے
دیکھنے لگا۔ پتھروں کے درمیان ایک سیاہ سادھتہ اور جنگلی پونے اس
دلکش دن سے اتنی ہی نا مانوس تھے جتنا اس عورت کا ماضی اُس کے
حال سے جسے وہ آج تلاش کر رہی تھی اور میرے ذہن میں اس رات کا
خیال گھومتے لگا جب بقول اُس کے ”دا اس کے سر پہ جنوں سوار تھا، اور
ساتھ ہی ساتھ وہ نوجوان جوڑہ بھی جو اس گرم اور تاریک تہلی میں بیٹھا ہے
قانون پا کر ان سے مغلوب ہو گیا تھا۔ برف کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے
اور شعلوں پر سے اڑتے ہوئے اس کے بالوں پر گر گئے تھے۔ یہاں تک کہ
وہ ان سے اٹ گئے اور اس نے سسکیاں لیتے ہوئے بچوں کی
طرح انہیں پکڑنا شروع کر دیا۔“

”میری لڑکی کی شادی کیلئے بڑا عجیب دن ہے،“ اس نے کہا
اور پھر ایک دم گھبر کر بولی ”نہیں نہیں وہ اپنی ماں کو نہ جان سکے گی، وہ
بہت آرام سے ہے،“ اور زمین سے اپنا ہیٹ اٹھائے پھر وہ کھڑی

ایلیا جون۔ جولائی ۱۹۷۷ء

ایک لمحہ بعد پھر اُس کے ہونٹ پکپکائے۔
 ”خدا حافظ!،“

اور وہ دروازے میں سے گزر کر نیچے پگلا نڈی کی تہ میں
 ڈوب گئی۔

اس کے چلے جانے کے بعد کچھ دیر تک میں وہیں برف اور
 دھوپ میں بیٹھا رہا۔ تب اٹھ کر چلتی ہوئی گھاس کی طرف دیکھا
 لہراتے ہوئے شعلہ اور تیلادھواں، خوبصورت اور زندگی
 بخش معلوم ہو رہا تھا۔ لیکن اپنے پیچھے وہ جلتی ہوئی شاخوں
 کے ڈھانچ چھوڑ رہے تھے۔

ایک بار دہرے بعد ان کی جگہ ہری اور ننھی ننھی گھاس
 کی کوئیں چھوٹ آئیں گی اور سوچ کی روشنی میں لہرائے لگیں گی۔
 یوں ہی چلتی رہتی ہے یہ دنیا!

تعمیر اور تخریب، تخریب و تعمیر کتنی عجیب بات ہے!

ہو گئی وہ اب مجھے واپس جانا چاہئے اور نہ گاڑی سے رہ جاؤں گی اور
 گاڑی سے رہ جائیکے معنی یہ ہیں کہ میں اپنے وعدہ پر نہ پہنچ سکوں گی۔
 ہیٹ اوڑھ لینے کے بعد اس نے اپنے چہرہ پر ہاتھ پھیرے اور
 اور گردن کو دبلا کر دیکھا کہ وہ جلتی ہوئی آگ کی طرف دیکھنے
 لگی اس کی بسے لپسی اور بیچارگی دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ
 اس شرک پر پُرس ہوئے رومی جوتے کے ماننے ہے، اپنے ماحول سے
 بگڑا اور نامانوس!

”میں نے یہاں آکر غلطی کی۔۔۔ اس نے کہا۔“ مجھے سوائے تکلیف
 کے اور کیا ملا اور اب تو تم بھی بیٹھے بیٹھے اکٹائے ہو گے، چھا خدا حافظ،
 آپ کے حام کا شکر ہے!“

اور اس نے میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا جنہیں نازی پن
 نہ تھا بلکہ خالص انسانی نگاہیں، الجھی ہوئیں اور پریشانی۔ دوسری مرتبہ
 تعمیر اور تخریب، تخریب و تعمیر کتنی عجیب بات ہے!



fine

خود داریاں

۶۴ نیساں اکبر آبادی

مگر قرار تو لے کر کے بے قرار مجھے
 پھر آچلا ترے وعدوں پر اعتبار مجھے
 وہ ایک میں کہ نہیں کچھ بھی اختیار مجھے
 جب آچلا تھا ذرا لطیف انتظار مجھے
 ہنسی کی بات بھی ہوتی ہو ناگوار مجھے
 پھر اور کس کا ہودنیا میں اعتبار مجھے
 مثال خار کھٹکتی ہے یہ بہار مجھے
 نہ اختیار انھیں ہے نہ اختیار مجھے

یہ کیوں کہوں کہ نہ تڑپا لگا دیا مجھے
 دیا فریب طبیعت کو آج پھر میں نے
 وہ ایک نم کہ نظام حیات ہے تم سے
 مری نگاہ کو تصور نے ان کو دیکھ لیا
 فخر دگی دل و حشر زدہ کی لے تو بہ
 جب اپنے آپ کو دھوکے دے رہی ہیں دیکھنے
 مری نظریں ہو جب بہار کا انجم
 نہ مجھ کو دل پر ہے قابو نہ انگوٹھوں پر

بہت عزیز نہیں خود داریاں بھی اینساں
 شکست حسن نہیں ہوتی ہے ناگوار مجھے

ایضاً جون جولائی ۱۹۶۲ء

نیاگ

حرف آخر کا ایک ق

(خدا زید عیسیٰ واکر کے دنیا کے مناظر و مکہ رہا ہے ان مناظر میں سے آپس کا دربار ہی ایک منظر ہے)

ابلیس

اے دباؤ، دہشت، تاریکیو، بیماریو
ہاں مرے اس قصر پر لہ ابد جاہ و حشم
حاضری دینے کو اپنی اپنی قبروں سے اٹھو
نکلو اے بوسیدہ لاشو تربتوں کو توڑ کر
اے گدھو، چیلو، بھینک اٹو جنبش میں آؤ
بازوؤں کو پھڑپھڑاؤ، ظلمتوں کو تھر تھراؤ
ظلمتو ہر سمت سے اُٹھو، تجلی سے لڑو
پر فشاں ہو جلد انسانوں کے اعمال سیاہ
ہاں پیو اے ساحرو، آ آ کے مجید و حساب
ہاں میرے چاروں طرف اس بھتہ دل کھول کر
ہاں جگاؤ اپنے اپنے ہیراے جادو گرو
آؤ اے بھوتو چڑیلو برق رفتاری سے آؤ
اے ریاکاری کی روح بدایاں بن بن کے آؤ

آؤ اے میرے رفیقو اے مرے درباریو
اے گناہوں کے پھر کے اے بغاوت کے ظلم
اے ٹھگو، اے قاتلو، اے ڈاکو اے خونیو
آؤ اور اس بام پر منڈلاؤ بازو جوڑ کر
اپنی آنکھوں کو نکالو اپنے بازو پھڑپھڑاؤ
ہاں لگاؤ دین کے بھیجے پہاں ٹھونگیں لگاؤ
تیرہ شب کا روز روشن ہے آؤ چمکا دڑو
جلدہ گر ہو آدم و حوا کے فیضان گستاہ
تیلیوں کے کاسہ ہائے سر میں چانول کی شراب
آؤ اور لڑھکواؤ ہزاروں مردہ خنریوں کے سر
اڑو ہوا، ناگ، سنپو، آؤ بھگدو گھیرو
آؤ جینو، غل مجاؤ، بھبھناؤ، ممناؤ
آؤ اس آئینے کے گنبد پر گرجو گھر گھڑاؤ

اُوس میدان میں دوڑو، بڑھو، ریگو، چلو
کیکڑو، گھونسو، کوڑو، کنکجورو، بچھو
ہاں دکھا دے ظلمتوں کو اے مرے سینہ دلخ

کہ یکا یک زبردست دھماکہ کی آواز پیدا ہوتی ہے، تاریکیوں کے دامن دراز تر ہو جاتے ہیں۔ زمین لرزے اور ہوا چیخنے لگتی ہے، اور دفعۃً ابلیس کا لشکر حاضر ہو کر شور و غل اور بلبل بجانے میں مشغول ہو جاتا ہے اور ابلیس اپنی بیگم کے دوش بدوش تخت پر بیٹھا جاتا ہے اور بیٹھتے ہی اپنے درباریوں کو حکم دیتا ہے)

شاہزادی کل ہوئی ہے دفن جو اس باغ میں
ہاں چڑالاؤ چٹیلو، اس کی زلفِ عنبریں
اسکے اعضا کا تناسب اسکے رخساروں کا نور
نور عصیاں کا ہے اب تک جس کے دل کے مرغ میں
اس کی آنکھیں، اس کی گردن، اسکے لب، اس کی جبین
لاؤ کشتی میں لگا کر مسیری بیگم کے حضو
دکھ طرفۃ العین میں مری ہوئی شاہزادی کا جمال ابلیس بیگم کے چہرہ پر دکھنے لگتا ہے۔ تمام درباری مسرت سے تالیاں بجانے لگتے ہیں اور شیطان دوبارہ حکم دیتا ہے)

پیرزن کی چشم تر تاریک موتی رول دے
ہاں بجا اے کاوشِ عصیاں فواحش کا سنا
اے ہیمنہ تمنّاؤ، چلو کر تب دکھاؤ
اے منجھل خوری کی دیوی جلد شر کا راگ کا
جلد ارنگی اٹھا اے جھوٹ دانائی کے ساتھ
گوںچ اٹھو چاروں طرف اے فحش لفظ گوںچ اٹھو
ہاں کر لچکا شرارت، کا کلیں چپکے عناد
ڈانٹو، ہاں اپنے اپنے منہ پہن کر خاک آؤ
حکم دیتا ہوں کہ مل جا خانہ عصمت کی بو
اے سیہ کاری کے ارمان بدی کے ولولو

شاہد عالم فریبی زلفِ شب گوں کھول دے
ہاں دکھا دے دفترِ انگور سینے کا ابھار
بھیڑیوں کی ہڈیوں سے اپنے تاشور، بجاؤ
اے دغا کے دیوتا خونیں مجیروں کو بجا
ہاں زرت کر بدظنی کی روح برنائی کے ساتھ
تال دو جادو کے نعرو گالیوں کو تال دو
رقص کر کو لہوں پر رکھ کر ہاتھ اے ریح فساد
چاہتی کیونکر ہو سچے بھاؤ کر کے یہ بتاؤ
ہاں برہمنہ ہو کے گردن کو ہلا اے کام دیو
پیشواؤں کو پہن لو، گھونگروؤں کو باندھ لو

کہ یکا یک خبیث ارواح کا رقص دسرو شروع ہو جاتا ہے) -

(ظوفان کی جے شیطان کی جے کے عنوان سے یہاں اک ترانہ ہے)

(اس ترانہ پر اہلبیس فرط مسرت سے کننا شروع کرتا ہے)

شکر ہے اہلبیس پر واجب خدا نے پاک کا
جس کے جتنوں مجھ سے بگڑا تھا الا العالمین
اس زمیں پر ماں علی الزعم خدا نے آسماں
اور یہ جو ہیں صحیفہ طاق میں رکھے ہوئے
کر چکا ہوں میں نرالا انتظام ان کے لئے
دیدنی ہے میری تفسیروں کا عالم آج کل
میرے حلقہ میں ہے داخل ہر فقیہ ذی حشم
کی گئی ہے نوشکا فی اس قدر آیات میں
حکم جس کا رات کو کرتا ہو دن اور دن کو رات
مد خاک پر سرکش فرشتے خاک پر کھدے ہیں
کا مرانی ہو چکی ہے مجھ کو اپنے کام میں
گو پیوں کی تاب نہ بخس کا رنگ جبین

آگ کے قدموں پر سر رکھا ہوا ہے خاک کا
آج اس آدم کے بچے ہیں میرے زیر نگین
آج میرے ماتھے میں ہے نوع انسان کی عنان
ہو چکے ہیں یہ تو کب کے ضبط میرے حکم سے
حلق سے نیچے اترنا ہے حرام ان کے لئے
کثرت معنی سے ہر آیت ہے مبہم آج کل
حکم سے چلتا ہے میرے ہر محدث کا قلم
بہ رہا ہے ہر سفینہ سیل تا ویلات میں
اس سے سجدے کیلئے کتنا مختار ب کائنات
تاب اس توہین کی سرکش فرشتے کو نہیں
ہر پیغمبر کی نشانی ہے مرے گودام میں
شیام کی لے ، نوع کی کشتی ، مسلمان کا نگین

۶۸

خاتم دستِ سلیمان و عصائے موسیٰ
کر لیا ہے فرق ان سب کو مرے خدام نے
الغرض ہر شے جو حق وابستہ پیغمبری
جس کو مجھ ٹلانے کی قوت ہو وہ آئے سامنے
راکھے بعد خدا ناراض ہو کر در بچہ عرش بند کرنے کا حکم دیتا ہے اور انبیاء سے جواب طلب کرتا ہے -

نغمہ آہستہ خرام

معجزہ دیکھا سرِ شام آپ کا	مطلع خورشید ہے بام آپ کا
یاد ہے اب تک وہ زراہِ کرم	وعدہ پہ آنا سرِ شام آپ کا
ہار ہوئی آخر کار آپ کی	بازی گیا جیت غلام آپ کا
میرا وہ اصرارِ نشیدِ غزل	عذریں وہ نرم کلام آپ کا
رات کی تنہائی میں آخر وہ خود	نغمہ آہستہ خرام آپ کا
مٹ کے رہے دونوں تیر و صل	درد مرے دل کا ز کام آپ کا

دعوائی میخوار می حسرت غلط

آپ کی بوتل ہے نہ جام آپ کا

خاکستر

اُلجھی لُجھی سانوں سے اب زینت کسا مان کیا ہوگا
 ہوگا کیا جینے کا سہارا زینت کا سا مان کیا ہوگا
 آنسو بن کر ٹپکا بھی تو کار نمایاں کیا ہوگا
 غرق ہوئے تو ہو جائینگے، کار نمایاں کیا ہوگا
 اُلٹے میدان سے شکوے پر وہ کار فرماں کیا ہوگا
 حسن بہاراں، کیف بہاراں، جوش بہاراں کیا ہوگا
 طوفان طوفان بہتے پھرنا، رسوائی ہے کشتی کی
 کشتی نذرِ موج بلا ہے، موج بلا کا کیا کہنا
 ان کی مرضی، جبرِ سلسل، ہستی سراپا مجبوری
 قیدِ حیات و جبرِ شہادت، اُس پہ فریبِ مختاری
 ہوش گریزاں، شکوے لرزاں، گویائی کی تاب نہیں
 روتی ہوئی آنکھوں کی جگہ کچھ اشک ہیں نگینِ رنگیں سے
 ان کا قصہ جمید نہیں کچھ، دل کا فسانہ راز نہیں
 کعبہِ دل آتارِ شکستہ، ان کی نگاہیں کفرِ تمام
 موسمِ گل میں ٹکڑے ہونا اور ہوا میں اڑ جانا
 کوئل ہویا بیلبل ہویا جھرنے ہوں کہساروں کے

جینا تو مر مر کے ہوا تھا، مرنا آساں کیا ہوگا
 لاگ نہیں اب تجھ سے بھی دل کو اے غم نہاں کیا ہوگا
 اے غم نہاں! اے غم نہاں! اے غم نہاں کیا ہوگا
 موج کے اٹھنے گرنے سے نقصانِ طفاں کیا ہوگا
 عشق ہی آنکھیں نیچی کر لے، اُٹھن پشیاں کیا ہوگا
 دیوانے گلشن میں نہیں مرکزِ یہ گلستاں کیا ہوگا
 بچ بچلے تو ذنب کو اندازہ طوفاں کیا ہوگا
 ساحل تک پہنچا بھی دیا تو ہم پرا حساں کیا ہوگا
 اپنے بس میں کچھ بھی نہیں تاحد امکان کیا ہوگا
 تجھ سے بڑھ کر اے غم ہستی کوئی زنداں کیا ہوگا
 شوق کے ان طوفانوں میں وہ شوق پشماں کیا ہوگا
 اس سے زیادہ سوزِ محبت اور نمایاں کیا ہوگا
 میرے دواک اشکوں سے یہ اور نمایاں کیا ہوگا
 شمع و برہمن کچھ تو کمو، انجام ایماں کیا ہوگا
 اس سے بڑھ کر اے غم و حشمت مصرفِ دماں کیا ہوگا
 کوئی بھلا سا غری طرحِ سستی میں غزلِ خوان کیا ہوگا

(یہ کلامی نظمیں ہمارے پتھر کے دل کے گوشے میں لکھی گئی ہیں)

شکست

تم سے بیرنگی ہستی کا کلا کرنا تھا!

دل پہ انبار ہے خوں گشتہ تمناؤں کا آج ٹوٹے ہوئے تاروں کا خیال آیا ہے
ایک میدہ سا ہے مفلوج سی امیدوں کا چند پڑ مردہ بہاروں کا خیال آیا ہے
پاؤں تھک تھک کر رہے جاتے ہیں مایوسی میں پُرمحن راہ گزاروں کا خیال آیا ہے

ساتی و باد نہیں جامِ دلب جو بھی نہیں

تم سے کہنا تھا کہ اب آنکھیں آنسو بھی نہیں

روزِ بہقان دھند لکے میں ہوس ہوتا ہے رنگ بھرتا ہے شبِ دروز کے افسانے میں
روزِ چشموں سے اُلتا ہے بہاروں کا لہو خشک ہو جاتا ہے جا کر کسی دیرانے میں
لالہ زاروں میں اُگا کرتا ہے بازار کا روپ شے جاتے ہیں صنم روزِ صنم خانے میں!

کرمِ شہوت کے پتوں سے بھی محروم ہیں جو

ریشم و اطلس و کخواب بنا کرتے ہیں!

میرے پندار کی زنجیر گلی جاتی ہے اس خرابے میں کہیں کوئی قدحِ خواہ نہیں!
وہی دُرسودہ عقائد نئے پیمائش ہیں آج دیرینہ ہوس کا رہوس کا نہیں!
سرگرمیاں ہوں مرا زعمِ نظر ٹوٹ گیا اب سرے گرد کوئی آہنی دیوار نہیں!

اب اسی حال میں رہنا ہے ستم سہنا ہے!

اب مجھے کچھ بھی نہیں کچھ بھی نہیں کہنا ہے!

غزل

ہو گئی صبح ہوئے جاتے ہیں افسردہ چراغ
چاندنی نیم کے سائے تلے اب سو بھی گئی
چور ہے تھک کے جوانی کے ہراک نغمے کی
دل کی آواز فضاؤں میں کہیں کھو بھی گئی
دوڑیں احساس پہ اب بارہیں مینا وایاغ

آہ وہ بیتے ہوئے لمحے محبت کے امیں
تیری ندفوں کی گھنی چھاؤں میں جو ستانے
ہا نپتے آئے تھے تپتے ہوئے صمراؤں سے
بس بھرے ہونٹوں سے بے نام ہی لذت پائے
رہ گئے تیرگی غم کے تلے دیہ کے کہیں

اب ترے ہاں نہیں آؤں گا، نہیں آؤں گا
منزلیں لاکھوں ہیں ٹھکرا کے جنہیں آیا تھا
رہ میں تارے بھی ہیں، میخانے بھی گل بھی جن سے
اپنی معصوم جوانی کو بچا لایا تھا،
اب کہیں بند کئے آنکھ چلا جاؤں گا

ہو گئی صبح، ہوئے جاتے ہیں افسردہ چراغ

غزل

وہ بیخودی ہے کہ اب بیخودی نہ جائے گی
میری شراب کی مستی کبھی نہ جاسے گی

نہ جائے گی غلش عاشقی نہ جائے گی
جگر کا درد نظر کی نمی نہ جائے گی

حریم خلوتِ جاناں ہے وہ مقامِ ادب
نگاہ سے بھی جہاں بات کی نہ جائے گی

ہزارِ حسن میں شیوے ہوں بے حجابی کے ل
مگر نگاہ کی شرمندگی نہ جائے گی

ہزار بار کرے حسنِ اہتمام سکوں
دلیغِ عشق کی آشفتگی نہ جائے گی

ہزار عشق کو ہونا آشنائی پر
مگر وہ حسن کی بیگانگی نہ جائے گی

اُسی نظر میں نہاں رازِ عاشقی ہوگا
وہ اک نظر جو تری سمت کی نہ جائے گی

یہی رہی غلشِ عاشقی اگر تا باں
تو بے قرارِ دل ضبط کی نہ جائے گی

غزل

عرقِ آلو دکنی کا پُرخ تا باں ہونا
اپنے ہی نور میں خورشید کا پنہاں ہونا

زیر لب کیکے کچھ، انگشتِ بدنہاں ہونا

یہ ہے دیوانہ بنانا کہ پشیمان ہونا

کچھ نہیں اسکے سوا جوشِ گلِ موسمِ گل

ایک ہنگامہ پہ چاک گریباں ہونا

عشق پر ختم ہے یہ طرزِ گرفتاریِ دل

آپ ہی اپنی تمناؤں کا زنداں ہونا

نشد نکھوں میں چرخِ اشکوں کا طوفانِ مدا

سیکھ لے تم سے کوئی حال کا پیرسانِ مدا

عشقِ شوریدہ کو سودا ہے اُسی منزل کا

رازِ مبتلا ہے جہاں راز کا عرفاں ہونا

عشق ہے نیمِ تماشائی، تماشا کی بھی

آپ ہی دیکھنا اور آپ ہی حیرانِ مدا

یا اُسِ عمد کی جب کانِ سنا کرتے تھے

گل کی آغوش میں نکمت کا غولِ مدا

ہے اثرِ دل کے دھڑکنے میں بھی نغمہ، لیکن

پہلے درکار ہے دورِ روح میں چلاں ہونا

طیارہ

موت کا اک قہقہہ غارت گری کی اک ہنسی
بربریت کی قسم پیمانِ تخریبِ حیات
سینہ ایجا دکا اک زخمِ خونابہ فشاں
اک پریشاں سی قیامت ایک آوارہ عذاب
ایک ظلمت ریز بادل ایک آندھی تند و تیز
نیستی کی چچ کربِ زندگی کی اک چکار
چچ پیما ایک آوارہ بگولا موت کا
ایک ہتاسا جزیرہ ایک اڑتا سا غبار
ایک کوہِ آتش افشاں ایک کھائی موت کی
ایک معلق زلزلہ انگڑائیاں لیستا ہوا
ہم نشیں وہ آسماں پر دیکھ طیارہ اڑا
بادلوں کو چیرتا کہرے میں در اسے لگا

۷۴

ایک آشفستہ تباہی ایک برہمِ نیستی
ایک ایسی صبح جس کی گود میں تاریک رات
ترکیش غارتگری کا اک خدنگ بے اماں
ایک رُم خوردہ تغیر ایک بھٹکا انقلاب
اک ہلاکت خمیز طوفاں شعلہ بیز و شعلہ ریز
اک تلاطم خمیز ساحل اک خزاں پرورد ہمار
جنبشیں کھاتا ہوا سا ایک جھولا موت کا
اضطراب روح فطرت فستہ گیتی شکار
ایک ”انگڑائی“ فنا کی اک ”جمائی موت کی
زندگی کو اک پیغامِ فنا دیتا ہوا
آگ کے طوفاں کو لیکر دیکھ انگڑا اڑا
ابر کے ٹکڑوں میں چھپ چھپ کے نظر آنے لگا

اب فنا کے ہاتھ ہو گا زینت کا برہمِ نظام
موت اس صورت سے لیگی زندگی سے اتمام

آسماں میں اب یہ طیارے اڑائے جائیں گے
اب فضا میں آتشیں طوفاں اٹھائے جائیں گے
مسندوں میں آگ، محلوں میں بستاؤں میں آگ
کو چہ و بازار میں شعلے، طرب خانوں میں آگ
جنگلوں میں آگ بھڑکے گی گلستاؤں میں آگ
آگ کے شعلے گرائے جائیں گے افلاک سے
خرمن تہذیب سے اٹھتا رہے گا اک دھواں

اب اسی صورت سے قصر و ہام ڈھائے جائیں گے
اب بساطِ خاک پر شعلے بجھائے جائیں گے
دامنوں میں آگ بھڑکے گی گریباؤں میں آگ
معبودوں میں آگ لگ جائے گی ایوانوں میں آگ
کشتیوں میں آگ ہوگی اور طوفاؤں میں آگ
آگ کے طوفاں اٹھائے جائیں گے اب خاک سے
اب یوں ہی گزرے گا ہستی سے فنا کا کارواں

یہ جو اڑتا جا رہا ہے آسماں پر ہم نشیں
ہاں ”سکونِ روحِ آدم“ ہے یہ طیارہ نہیں

غزل

نہیں ہوتا ملاوائے غم نہیاں نہیں ہوتا
 پریشانی میں مہنس دینا جسے آسان نہیں ہوتا
 محبت نے مجھے پہنچا دیا ہے اس بستی پر
 طوافِ کعبہ برحق بندگی واجب مگر زاہد
 حفاظت چاہئے دلی حفاظت چھوگشن کی
 جہاں بھی جی میں آئے سر جھکا دے نیاز
 نشیمن کیا چمن سے ربط ہونا چاہئے دل کو
 محبت کو سمجھنا ہے تو ناصح خود محبت کر
 سبھی کچھ ہو رہا ہے اس ترقی کے زمانے میں
 بظاہر مہنس لیا جاتا ہے دل خنداں نہیں ہوتا
 وہ کم ہمت مسز اور غم جاناں نہیں ہوتا
 کہ اب اُن سے بھی میرے در کا دریاں نہیں ہوتا
 بغیرے پرستی آدمی انساں نہیں ہوتا
 اُجڑ جاتا ہے دل گلشن کبھی ویراں نہیں ہوتا
 مذاق سجدہ پا پند و رجاں انساں نہیں ہوتا
 نشیمن کے اُجڑنے سے چمن ویراں نہیں ہوتا
 کنارے سے کبھی اندازہ طوفان نہیں ہوتا
 مگر یہ کیا غضب آدمی انساں نہیں ہوتا

فراق یار میں مرنا خمار آسان ہوتا ہے

فراق یار میں جینا خمار آسان نہیں ہوتا

بنتِ عم سے!

تم سے اک بات کہنے کی بڑی اچھی بات
یہی ڈر ہے کہ کہیں تم نہ خفا ہو جاؤ
تم سے کہنے کا بہت دن ارادہ تھا مرا
اے خوشا! طالع بیدار کہ وقت آ ہی گینا

دیکھتی ہو وہ شفق پھول رہی ہے کیسی
طائر اڑ اڑ کے بسیرے کو چلے آتے ہیں
چاند کے روپ میں اتنی تو نہ تھی رنگینی
شاید اس مندی لگے ہاتھ کی سُرخ ہوگی
نرم ہے موج ہوا پھول کھلے جاتے ہیں
دیکھو! ٹوٹی تو نہیں کوئی تمہاری چوٹی!

ہاں مگر یاد رہے یاد رہے راز ہے یہ
لو سٹوکان ادھر لاؤ مرے مُنھ کے قریب
یہ کہا نہ جلد کہو "خیر تو پھر سن لینا
کیوں جمع جکتی ہو کوئی چیز لئے لیتا ہوں؟
کچھ نہیں جانتیں؟ انجان بنی جاتی ہو
"کوئی نظم؟" وہی نظم جو پیاری ہے بہت
جس میں شاعر نے کہا ہے کہ "محبت ہے مجھے
دل میں دو اس کو جگہ دل ہی کی آواز ہے یہ
اے لو شرماتی ہو تم، تم بھی ہو کس جہ عجیب؟
کام ہے تم کو کسی اور کو یہ حل دینا
کیوں بگڑتی ہو ادھر آؤ کئے دیتا ہوں
کوئی نظم ہے وہ تم جو کبھی گاتی ہو
ہاں وہی نظم جو تم کو بھی تو بھاتی ہے بہت
بنتِ عم تیرے تصور ہی میں راحت ہے مجھے

چاہتا ہوں میں تمہیں بس یہی کہنا تھا مجھے

کیا کہا، اب نہیں بولو گی کبھی تم مجھ سے؟

کسوفی ط

تازہ رسال

برہان - جون -

فلسفہ -

جو فقار گروہ اپنی تین قسم کے سوچنے والوں کے بین بین پیدا ہو گیا اور انہوں نے ان تینوں قسم کے سوچنے والوں کے بہترین اصول لیکر کچھ کر دیئے۔
ڈاکٹر ولی الدین کے متذکرہ بالا معنوں سے جو انہوں نے بھجوا کر برہان میں لکھا ہے۔ ہم یہاں کچھ پیش کرتے ہیں۔

۱۔ موجودہ زمانہ میں ہمارا نقطہ نظر زیادہ تر انفرادی واقعہ ہولہے ہم بنیاد پرستی لگا کر غور نہیں کرتے بلکہ معاشرتی، سیاسی، ادبی، اخلاقی اور مذہبی نگاہ سے اسکی تحقیق و تدقیق کرتے ہیں۔ قدما یونان کو نباتات و تخیل عالم کا مسئلہ پر نشان کیا کرتا تھا لیکن تئیر سے انکی مراد مادی تخیل تھا یعنی مادی ذرات یا اجزاء کی حرکت یا نشو و نما، زوال و فنا کے مظاہر۔ چنانچہ تئیر کا خیال تھا کہ قدرت کے کارخانہ میں تخیل نہیں ہے۔ اسکو بظاہر جو تخیل دکھائی دیتا ہے وہ محض تئیر والہ تئیر ہے، لیکن ہر قلیئوس کو یقین تھا کہ نباتات و سکون کا نباتات کی کمی تئیر میں نہیں۔ دنیا سر تا پا تئیر، متحد، متنوع ہے، یہاں اور اسی قسم کے مسائل ہم میں شک نہیں ایک لاجواب ہیں لیکن ہماری دلچسپی دینا کے کئی اور طرح کے تئیر سے وابستہ ہو گئی ہے، ہم معاشرتی رسوم، سیاسی علائق، اخلاقی آداب و مذہب اور ادبی معیارات کے تغیرات سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں لیکن اس قسم کی تئیر غریب دنیا میں توجہ کی اسی قدر محتاج ہے جتنی کہ اجزائے مادی کی تئیرات الہی دنیا۔ لہذا فلسفہ کی ضرورت یقینی، فوق صرف تئیر ہے کہ اب فلسفہ حیات، اسکی قدر و قیمت، اسکی بابت و نہایت، اور غرض و غایت کی توجہ کرنا ہے اس لئے ارتقاء ترقی، ذہن کے طریقے، کردار و معاشرت کے مسائل زیادہ نمایاں اور پیش پیش ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ ہمیشہ کیلئے صحیح ہے کہ فلسفہ اس دنیا کو سمجھنے کا نام ہے جس میں ہمارے اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

شاید قارئین میں سے بہت کم ایسے ہوں گے جن کے ذہن میں کبھی اس قسم کے سوالوں کا نہ اٹھا یا ہوگا۔ کیا خدا کا وجود ممکن ہے، یا اسوائے مادہ اور ایمر جی کے کوئی شے نہیں؟ مادہ کا مایہ خیر کیا ہے؟ کیا درخت سے لہو وادہ کوئی چیز حقیقی ہو سکتی ہے؟ اگر علوہ فرما لی صرف مادہ کی ہے تو در کیا چیز ہو؟ کیا یہ ذہن میں نہیں پایا جاتا؟ تو کیا ذہن مادی سے جدا نہیں؟ ایمر جی و فکر کرنا، درد و الم ہونا، کیا صرف مادی ہی جسم سے تعلق رکھتا ہے، مادی ایشیا جون، جولائی مسئلہ ۶

فلسفہ کا وجود انسان کے شکوک کی بنیاد پر ہے۔ ہر سوچنے والا انسان جب انسانی باتوں یا ایک عام روش سے اکتا جاتا ہے تو اسے خیالات اس کے گرد حلقہ کرتے ہیں۔ وہ کہیں کس طرح؟ اور کیونکر؟ ایک جال میں گھر جاتا، اس کا دماغ اسے بار بار گستاخ ہے۔ اگر یہ یوں ہی ہے تو یوں ہی کیوں ہو۔ کس اور طرح کیوں نہیں اور خیالات کی بھی رودماغ کو فکر کی دعوت دیتی ہے۔ انسانیت اور ماورائے انسانیت کا تخیل آدمی کو کھیر لیتا ہے۔ طبیعیات اور ما بعد الطبیعیات اخلاقیات اور مدنیات، خیر و شر، حسن و قبح، رحم و انصاف اور اسی قسم کی تمام چیزیں جن سے زندگی کا ایک گہرا تعلق ہے آدمی انکو بار بار سوچتا ہے اور یہی سوچا زندگی کا ان منزلوں میں آدمی کو گھسیٹ کر لے آتا ہے، جہاں سے انسان کی سطحی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ ان کے ذہن میں بار بار یہ خیال پیدا ہو کر کہ زندگی محض خوردن، نوشیدن اور مردن نہیں آدمی نئی راہ پر ڈال دیتے ہیں۔

اس طریقہ سے ہماری تہذیب و تمدن اور معاشرتی اصولوں کا حجم بڑھا اور ہر شخص نے اپنی حیثیت اور فکر کے مطابق اصول مرتب کئے۔ ایک گروہ ایسے لوگوں کا پیدا ہو گیا جو زندگی کا مفہوم اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں سمجھتے تھے کہ وہ بار بار پیش کوئی عالم دوبارہ فیض

دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہو گیا جن کا خیال تھا کہ زندگی کو ضمیر کی آواز پر چھوڑ دینا چاہئے۔ چونکہ ضمیر ہی ایک ایسی چیز ہے جو بلا واسطہ خدا کی آواز کو سن سکتا ہے اور سنتا ہے۔ ایسے گروہ کے کچھ لوگوں نے زندگی کو محض ایک فریضہ تصور کیا اور انکی زندگی ایک سپاہی کی زندگی بن کر رہ گئی۔ وہ فرض پرکھنے، کے علاوہ انکی زندگی میں ذاتیات کو کہیں دخل نہیں۔

تیسرے گروہ کے لوگوں کے نزدیک زندگی نہایت تئیر لبقا کے سوا کچھ بھی نہ رہی۔ اسی حوالی کشمکش سے ان کے خیال کے مطابق ہم فکر کرتے آئے تھے اور اس زندگی میں بھی ہم کو وہی کشمکش جاری رکھنی چاہئے۔ جس طرح اکثر جانور گروہوں میں رہتے ہیں۔ محض اپنی حفاظت کی غرض سے اسی طرح ہم بھی گروہوں میں رہتے ہیں اور ہمیں اس جماعتی نظام کے ساتھ ساتھ افراد کا سماجی خیال رکھنا چاہئے

جسم و طیف ہے یا اس سے جدا ہے؟ میں زندہ ہوں؟ حیات کیا ہے؟ وہ کیا ہے جو بقول اقبال در تلخ و رنگیز ترست؟ ایک روز مجھے موت آئی، موت کیا ہے؟ کیا یہ انسانی شخصیت کا خاتمہ ہے؟ ابوالخاندانہ سے حیرت کے عالم میں کیا خوب پوچھا تھا۔
 الْمَوْتُ بَابٌ وَكُلُّ النَّاسِ مِنْهُ يَالَيْتُ شَيْءٌ يَنْفَعُ بَعْدَ الْبَابِ كَالْأَنْفِ
 ہم آزاد نظر آتے ہیں، کیا یہ صبح ہے؟ میرا خیال قمار کا حق ہم مجبوروں پر کبھی ہتھیاریگا!

حافظ کا خیال تھا کہ ع

پس آئینہ طوطی معتمداشته اند!

واقعہ کیا ہے! مجھ سے آپ سے ہر طرح کے افعال سرزد ہوتے ہیں، بعض اُن میں کے صائب ہیں اور بعض عقاید، صوابِ خطا کے کیا معنی ہیں؟ انکے معیار کیا؟ ہم میں سے بعض تلاشِ زر میں سرگرداں ہیں۔ بعض شہرت کے خواہاں اور بعض لذت کے دلدادہ اور
 ”خوش باش دے کہ زندگانی این است“

کے پیرو۔ کیا یہ درحقیقت اعلیٰ قسین ہیں؟ ان سے اعلیٰ وارفع نصیب موجود ہیں؟ مثلاً روا قیلے، دلائلِ نفس کو خیر و برتر قرار دینا، دنیا کی کوئی مصیبت دنیا کی کوئی خوشی، اطمینانِ خاطر کو صد نہیں پہنچا سکتی۔ چنانچہ بنی ہتھوس نے رومائے جاہل میں فلسفے کے تسلی۔ بخش لذات پر ایک طویل مقالہ لکھا تھا۔ کیا اس طرح

تلاش حق، فنونِ لطیفہ کا ذوق وغیرہ اعلیٰ قسین نہیں قرار دینا سکتا؟ ہم یہ تمام سوالات اٹھا سکتے ہیں، کیا ان کا جواب دینا ممکن ہے؟ علمِ انسانی کی حدود کیا ہیں۔ اس کی اڑان کتنی ہے؟ علاوہ ازیں فطرت و صنعت میں خوبصورت اشیاء میرا محاصرہ کئے ہوئے ہیں۔ اکثر بصورت بھی ہیں، حسن کیا ہے؟ ایک خوبصورت عمارت میں، ایک حسین چہرے

میں، موسیقی کے ترنم میں وہ کیا چیز ہے جس پر ہم کھٹک اند ہوتے ہیں؟ اگر آنکھیں نہ ہوتیں۔ ذہن نہ ہوتا تو کیا پھر بھی فطرتِ باطن میں ملبوس ہوتی؟ یہ سب فلسفیانہ سوالات ہیں۔ ان کا پیش کرنا انسان کی فطرت کا تقاضا ہے، ان پر غور کرنا، جگہ جگہ پر بھٹتی و تدقیق کے ساتھ ان کا مطالعہ کرنا، ان کے جواب فراہم کرنا کسی سچی فکر کا گویہ لاجل نہیں

فلسفہ ہے، یا جیسے فلسفہ کے شیدائی ولیم جیمسن نے کہا ہے، فلسفہ واضح طور پر نکال کر دینے کی ایک غیر معمولی مستقل کوشش کا نام ہے، یکدم دینا کہ نہیں، جانوروں کا نہیں، انسان کا ہے، ہر انسانی کا خواہ وہ حیوانیات کا پروڈیوسر ہو یا تاریخ کا!

گل کر صغیرک و پیسے ہی سے یہ زرد چراغ

آج بھی عیش کے لمحاتِ فسر دہ کیوں ہوں

جلگے لگاتے ہوئے رشیم کا پرانا ملبوس
 جسمِ افسردہ کی زردی کو چھپا ہی لے گا
 رات کے وقت بہر حال یہ نیلا خانوس
 تم سمجھتی ہو کہ خلوت کو سجا ہی لے گا

کل ہی ساز، بھی گیت، یہی جامِ شراب
 جھلملاتی ہوئی دیوار پہ بھڑکتے تھے
 رات بے شمع، یہ ستارے، یہ سنہرا مہتاب
 خلوتِ عیش میں کچھ سرد نہ ہو جاتے تھے

دھندلے دھندلے سے ابھی رشیمی پردوں کے ادھر
 حسنِ غربت کے نطاسے بھی یہاں کیوں لکھوں
 جھکے چہروں سے مجھے اپنے گناہ آئیں نظر نہ
 ایسے وہ چاند ستارے بھی یہاں کیوں لکھوں

ہاں ہٹا دو مری نظروں سے یہ پُر درد چراغ
 مرے گاتے ہوئے جذباتِ فسر دہ کیوں ہوں

ساقی جون۔

(سلام بھلی شہری)

نظم پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نظم کا شاعر غریب و پشیمانی ہے کچھ بیزار سا ہے۔ محفلِ عیش میں داخل ہونے سے پہلے اسکی نظر اس انداز پر پڑ جاتی ہے جو اس انجمنِ نشاط کیلئے ایک برا انگوں ہے۔ اگر ہم شاعر

ایضاً جون۔ جولائی ۱۹۷۷ء

کے ساتھ ساتھ ذرا سا ذہن پر زور دیکر کچھ سوچیں تو ہمیں اسکے پس منظر میں ایک ایسے انسان کی تصویر نظر آئے گی جس کے چہرہ پر ایک حزن و ملال اور آنکھوں سے بیزاری چمکی ہو ہے۔ اسکی نگاہوں کے سامنے محفل عیش و نشاط کا باب واپس اور وہ اپنے آپ کو اس میں غرق کر دینا چاہتا ہے اسکی آداس محفل نشاط میں آج پہلی بار نہیں ملے گا وہ اکثر آتا ہے اور جس طرح اس سے پہلے اسکے وقتی تعیش میں کوئی فرق نہیں آیا اسی طرح وہ آج بھی نہیں چاہتا کہ اس میں کوئی فرق آئے لیکن صرف تسخیر ہی کے الگ کر دینے سے ہی تو عیش کے لمحات فردہ ایک سنگ میں نہیں بدل جائیں گے اسکے لئے وہ کہتا ہے کہ جہاں اور چیزوں کا تعلق ہے انہیں یہ ریشی غلاف و پر لے ملیوس دھا پلین گئے۔ جہاں تک زندگی کی بے بسی کا تعلق ہے وہ وہ ایک تاریکی میں مدغم ہو کر رہ جائیں گے۔

نظم میں کہیں بھی نمایاں طور پر نہیں معلوم ہوتا کہ شاعر یہ تمام کچھ کہہ کر رہا ہے لیکن اس پس منظر پر نظر ڈالتے سے اس انسان کے سامنے ایک نسوانی پیکر نظر آئے گا۔ بہت دھندلا اور ہم سا جو پرانے ریشی ملیوس اتارنے کے بعد زندگی کا ایک بھیا تک تصویر ہے۔ سوزت کا ایک مستقل نظارہ اور اس تصویر کے ساتھ ہی اس ماحول میں سینکڑوں نسوانی پیکریاں، زرد سے ہیں۔ انسانی گناہوں کی ایک تصویر، چاروں طرف منڈلاتے ہوئے نظر آئیں گے،

یہ نظم فن کاری کا ایک اجماعاً منہ ہے۔ ایک فن کاری کی حیثیت سے سلام کو کچھ پس منظر میں رکھنا چاہتا ہے وہ وہیں رہتا ہے اور جس انداز نظم کا آغاز کرتا ہے وہ انداز آخر تک اسی طرح قائم رہتا ہے۔ اس منہا اس محفل عیش میں آئے سے صرف یہ ہے کہ وہ ایک لمحہ کیلئے ان انسانی آلائشوں سے منہ موڑ لینا چاہتا ہے جسے دیکھتے دیکھتے وہ اکتا گیا ہے اور نہیں چاہتا کہ اب دیکھے تاؤ فتنہ اس کا یہ غمار اور یہ ایک وقتی لطف ختم ہو جائے۔ اسکے علاوہ ایک چیز یہ بھی ہے کہ اگر وہ اس زرد شمع کی روشنی میں ان پرانے ریشی ملیوس اور زرد اجسام کو دیکھے گا تو اسے اپنے گزشتہ واقعات کا خیال آئے گا۔ اس محفل عیش کا جس کی داد وہ اکثر دیتا رہا ہے اور وہ اپنے گناہوں پریشان ہو گا۔ اس کا لطف ایک مستقل تکلیف بن کر اسکے دل میں ایک کسک پیدا کر دے گا۔ اور انہیں چاہتا کہ اس کے گاتے ہوئے جذبات فردہ ہو جائیں

وہ انہیں اجاگر کر کے لایا ہے۔

وہ نظم میں ابتدائی سے ایک تافیر پیدا کرنا چاہتا ہے ایک ہی سلسلہ خیال کو لیکر چلنا چاہتا اور اسے آخر تک قائم رکھنا یہ نظم کے شروع میں خیال ہوتا ہے کہ کہیں وہ ان تمام چیزوں کو دیکھ کر جو محفل عیش میں اس کے سامنے آئی ہیں لو کہہ کر نہ جائے لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ وہ ایک ہی وقت میں تعیش کو ش بھی ہے، نقد بھی، اور ایک فن کاری بھی لیکن اس کا یہ پہلو جس میں وہ ایک نکتہ جس کی حیثیت نسوانی زندگی اور محفل عیش کو دیکھتا ہے اتنا دیا ہوا ہے کہ وہ آخر میں ایک فن کاری ثابت ہوتا ہے سلام کی اکثر نظمیں وہ ایک فن کاری کی تراش خراش کا اچھا نمونہ ہیں۔ اگرچہ ان میں کہیں کہیں لغزش بھی ہو جاتی ہے۔

بہار داد و دیداری کا ایک احساس ہے۔ ایک انسانی ہمدردی کی رو، ایک غفلت اور خفا میں نہ صرف ایک آدمی بلکہ ہر شخص گرفتار ہے۔ ہر ذی حس اور سوچنے والا دماغ۔ اس غفلت میں نہ صرف سلام ہے۔ بلکہ یوسف ظفر بھی۔

چور کپڑا گیا — کپڑا ہی گیا آخر کار
رات کے ٹوٹتے تاروں کا سنبھالا لیکر
چپکے چپکے وہ بے پاؤں ہوا تھا داخل
بھوک اک خنجر بیاک مٹی اس کے دل میں
دل کی دھڑکن — وہ تو چپے یہ نکھر آئی مٹی
کئی راتوں کی ٹھکن اس کی نظر کے بل پر
آنکھ کے پردہ سے یہ اتر آئی مٹی
اسکی پڑ مردہ جوانی کا وہ دھا پنا تو تھا
ایک احساس کا پتھر یا ہوا الا شاعرا

سامنے کمرے میں کیا کچھ نہ تھا — سب کچھ ہی تو تھا
وہ زرد و سیم کی تعمیر کا گورکھ دھندا
پنے خود کا شستا انعام کا انبار عظیم
عیش کے جادہ ہموار کی روشن شمیں
مسکراتی ہوئی تصویریں بنی جاتی تھیں

ایشیا جون، جولائی ۱۹۷۷ء

(ادبیات)

ادبیات — رشتہ کی مٹی — رشتہ کی مٹی — رشتہ کی مٹی

ادب لطیف۔ جون۔ زندگی کی جس ضرورت کیلئے سلام زد
اجسام ریشی بلوس میں پوشیدہ کر رہا ہے اسی ضرورت کو ظفر ایک دوسرے
طریقہ سے پیش کر رہا ہے۔ ایک فنکار کی تعریف یہ ہے کہ وہ کوئی بھی موضوع
ہو اس طرح پیش کرے کہ کالوں کو گراں اور حسن لطیف پر بارنگز
اس موضوع پر جس پوٹو اظہار خیال کر رہا ہے پہلے بھی نظمیں لکھی جا چکی
ہیں۔ لیکن انھیں پڑھنے سے وہی لطف آتا ہے جو ایک فوجی بینڈ کو سنکر
آسکتا ہے۔ لیکن ظفر صرف

جو ر پکڑا گیا۔ پکڑا ہی گیا آخر کار

کہہ کر دماغ کو ایک روحانی اور مضطرب ماحول کی طرف
متوجہ کر دیتا ہے۔ جسے پڑھنے کے بعد جذبات ایک دم ایک لاوے کی طرح
ابن نہیں پڑتے بلکہ ایک کسک جنکے چین کر دیتے ہیں۔

رات کے ٹوٹے تاروں کا سمٹھالا ایک آرٹسٹ ہی کے قلم سے
لکھ سکتے ہیں اور پھر اس کے پیچھے جو گداز اور سوز چھپا ہوا ہے اسکی کیفیت
کچھ وہی شخص زیادہ سمجھ سکتا ہے جس کو ایک امید و بیم کی گھڑی درپیش
آئی ہو۔ نظم حقیقت ورومان کے مل جلے تاثرات لئے ہوئے آخر تک
ایک لطیف طنز پر مبنی کر رہ جاتی ہے۔ اور کبھی کبھی طبیعت میں ایک ہلکا۔
نفرت کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔

وہ زور و سیم کی تعمیر کا گورکھ دھندا
اپنے خود کا شتہ انصاف کا انبار عظیم
عیش کے جادہ ہموار کی روشن شمعیں

یہ سطر میں جہاں ہمارے سامنے ایک مشاق نقاش کو پیش
کر رہی ہیں۔ وہاں ایک تسمیز پر لب کبھی مجبور کرتی ہیں جنہیں کڑواہٹ
اور تلخی بدرجہ اتم ہے اور جب ہم سنتے ہیں کہ۔

اسکی پشمرہ جوانی کا وہ ڈھانچا تو نہ تھا
ایک احسان کا پتھر یا ہوا لا شافھا

اس وقت اسکے سوا اور کچھ نہیں سمجھتا کہ رفتہ رفتہ ازل چیرو
کی بزم کی کجائے۔ اس طرح کہ۔

عیش کے جادہ ہموار کی روشن شمعیں صدنی پڑ جائیں

اگر اس طرف سلام اور ظفر روزگار کے شاکی ہیں۔ تو دوسری
طرف جذبی اور روش غم دل کے شاکی ہیں۔ اور ان دونوں سے کہیں
نجات نہیں۔

اپنے پیچھے گھوڑا روکنے کے ساتھ
لپٹ لپٹ کر خوشی پر نہیں بگڑا ہوا
دل نازک کے دھڑکنے کی سنوں کا زہرا
مری آہ پر تھمتے ہوئے میری جانب
انکے ماتھے پر بگی نہ جادو کی شکن
انکے کھینچنے سے ہاتھوں کو جوئے کا کوئی
مری وحشت کا پتہ نہیں ہوئے تنگ نصیب
انکے لہجے ہو بالوں سے لہجے کا کوئی

دل ناشاد تری چپٹ مگر کیا ہوگا

نری فریاد کو سمجھا جڑ سمجھے گا کوئی

ادب لطیف۔ جون۔

ایسا معلوم ہو تو بس کہ جذبی ایک تذبذب اور کشش کے عام میں
سر جھکائے زندگی کے گزربے ہوئے لحاظ پر غور کر رہا ہے۔ خیالات کا ایک
سلسلہ ہے جو بندھا ہوا ہے۔ ذہن گزشتہ واقعات کو دہرا رہا ہے اور ایک چیمڑ
چھڑا اور لطیف رمز و کنایات جو دو جذبات سے ملے ہوئے دلوں میں ہوا
کر رہے ہیں ان کا تصور بندھا ہوا ہے۔ کبھی انھیں خفا کو دیکھتے کبھی ہمتوں کا
خیال آتا ہے جنہیں وہ چومنے کیلئے بے قرار رہا کرتا تھا۔ اور کبھی اس انتہائی
شوق کا۔ جب کوئی اسکے جلتے ہوئے ہونٹوں پر اپنے رخسار رکھ دیا کرتا تھا
اسے وہ منظر یاد آ جاتا ہے۔ جب کوئی اسکی آہٹ پر اپنے آپ کو نرم و
نازک انگلیوں سے بٹھا ہوا جاتے ہوئے اسکی طرف آیا کرتا تھا اور کبھی جب
اسکی انگلیاں کسی کے اچھے ہوئے بالوں سے کھیلا کرتی تھیں۔

اسے ان لطیف احساسات کا تصور بے چین کر دیتا ہے اور وہ
جس طرح خیالات اس کے ذہن میں آتے تھے اور جس طرح واقعات
ہو چکے ہیں۔ بعینہ اسی طرح انہیں اٹھا کر اپنے قلم کی ایک جنینیت کاغذ
پر ملے آتا ہے جس طرح اس نے اپنے ذہن میں دیکھا اسی طرح ہم نے
اسے کاغذ پر دیکھا اور اپنے تخیل میں ایک تصویر بنائی اور بغیر کسی
بہترین شاعری کے لحاظ سے وہ ہے جسکی تصویر بن سکے اور ہم بلا
و شبہ جذبی کی اس نظم کو پڑھ کر ایک تصویر کش کر سکتے ہیں۔

ایشیا جون، جولائی ۱۹۸۷ء

رات ہر نگہ بید ارگل افشاں ہی ہے
صبح تک خوابت شب بزم چراغاں ہی ہے
گرم رو قافلہ شوق مسراواں ہی ہے
جذب تہاں کو یوں ہی راہ نماہنے دے
کس کو معلوم ہے کس وقت چلے آئیں وہ
عالم شوق کو غافل نہ کہیں پائیں وہ
دل ناداں کہیں کہتے چلے جاسائیں وہ
بربط غم کو یوں ہی نغمہ سراہنے لے
بے اثر ہو غم الفت یہ نہیں ہو سکتا
حاصل عشق ہو فرقت یہ نہیں ہو سکتا
ان کولانے نہ صحبت یہ نہیں ہو سکتا
اس پر سب فلسفہ یاس فراہنے لے
دل ناداں نہیں معلوم وہ کب آجائیں
درکاشانہ آئیں کھلا رہنے دے
(لوٹن صدیقی)

۸۲ ادیب جون -

جدی اور روشن کے فلسفہ محبت میں بہت برفراز پہاں آن کر
پڑ جاتا ہے جہاں جدی کہتا ہے
پہر نری بات کو سمجھا ہے نہ سمجھ گا کوئی
اور روشن کے خیال میں

اب یہ سب فلسفہ یاس فراہنے لے
روشن یا یوسی کو گناہ خیال کرتا ہے اور اسی لئے اسکے یہاں حریف
ملاں نہیں یا یہ کہ اسکی نگاہیں اپنے مناظر سے دوچار ہونگی قوت نہیں
رکھیں۔ اپنے آپ کو امید کی آخری منزلوں پر دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کو
لپٹے جذبہ عشق پر اتنا اعتماد ہے کہ وہ یہ کہہ اٹھتا ہے۔
بے اثر ہو غم الفت یہ نہیں ہو سکتا۔
وہ یاس کا قائل نہیں ہاں ایک مسلسل کوشش کا ضرور قائل
ہے۔ اسکے یہاں شک کا شائبہ ضرور ہے۔
”کس کو معلوم ہے کس وقت چلے آئیں وہ.. میں اگر چہ

ظاہر طور پر ایک امید کی جھلک ہے لیکن اسکے پس پردہ ایک اہمائی
کیفیت تہاں ہے۔ یہ بھی بہت ممکن ہے وہ نہ بھی آئیں۔ کوئی وقت کا
تغیبن نہیں، کوئی خاص وقت نہیں لیکن ہاں ایک رو سخت اشعر میں
ضرور دوڑ رہی ہے، جو بار بار کہتی ہے۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ قرو
آئیں گے۔

مکن ہے زندگی میں آگے چل کر ایسے مقامات آجائے ہوں چلا
یا یوسی امید میں بدل جاتی ہو۔ اور بت ممکن ہے کہ روشن ان مقامات کو
ٹے کر چکا ہو۔ ورنہ عموماً یہی دیکھا گیا ہے کہ
روز امید بدل جاتی ہے یا یوسی میں۔

ادارہ

نئی کتابیں

انجمن ترقی اردو کی کہانی:- مولوی غلام ربانی صاحب سررشتہ
اردو رہنما (دہلی سے شائع ہوئی ہے) قیمت چار آنے

یہ کتاب انجمن کی ابتدائی حالت سے لیکر اس وقت تک کی جدوجہد
اور کاوش کی ایک مختصر کہانی ہے۔ زبان نہایت عمدہ اور برجستہ ہے اور بہت
مؤثر انداز میں لکھی گئی ہے۔ ہماری اکثر انجمنوں کی کیفیت کے پیدا ہونے میں دل و
ختم ہو جاتی ہیں اور بعض بعض تو اس خوبصورتی کے ساتھ یہاں ہوتی اور ختم
ہو جاتی ہیں کہ لوگوں کو کائنات کا بھی خبر نہیں ہوتی بالکل اسی طرح سے جس طرح
اسلام نے خیر اور کافر فرقہ تباہ کیا ہے کہ اس طرح ہوئی چاہئے کہ دائیں ہاتھ
کی بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو۔

در اصل اس قسم کے تمام کاموں کی بنیاد و کارکنان کے ذمہ اراۃ
یا غیر ذمہ اراۃ روپ پر ہوتی ہے۔ ہم لوگوں میں خلوص، ایثار و جانفشانی
اور نیک نیتی سے کام کرنا اسے لوگ بہت کم ہیں۔ اکثر لوگ کسی انجمن یا اسی
قسم کی کسی اور تحریک کی ذمہ داری محض اس وجہ سے قبول فرماتے ہیں
کہ انکی نظر تحریک سے ہٹ کر ذاتی شہرت یا کسی ذاتی مفاد پر ہوتی ہوگی
نہ تحریک کی کامیابی بھی ہو لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کامیابی ہو کیونکہ ذاتی
مقاصد تلاش کر کے ہوائے لوگ خود کام کرنے کے اہل نہیں ہوتے اھذا عقیدہ یہ ہے
کہ تحریک جہاں سے شروع ہوئی تھی وہیں ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔

ایشیا جون۔ جولائی ۱۹۷۷ء

کسی تحریک میں کام کر نیوالے عوام میں اہم کے آدمی ہوتے ہیں۔ پہلے وہ جو روپیہ صرف کر سکتے ہیں کام نہیں کر سکتے ایسے لوگوں کے پیش نظر محض شہرت اور ذاتی مفاد ہوتا ہے۔ دوسرے وہ جو کام کر سکتے ہیں روپیہ نہیں صرف کر سکتے۔ ایسے لوگ ضرورت سے زیادہ جو غائب ہوتے ہیں اور میرے وہ جو روپیہ بھی صرف کر سکتے ہیں اور کام کر سکتی قابلیت بھی رکھتے ہیں لیکن یہ قسم عوام ناایاب ہے اور اگر ملتی ہے تو بہت مشکل سے۔ بعض اوقات اول الذکر قسم کے لوگوں کی بہت بھی درست ہوتی ہے مگر اتفاق سے جو کام ان کے سپرد کیا جاتا ہے اس سے ان کی طبیعت کہ کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔ کام بے دلی سے شروع ہوتا ہے نتیجہ یہ ہے کہ سب کچھ خراب ہو کر رہ جاتا ہے جس کی قیمت دائیں یا بائیں کسی طرف لگانے سے بھی نہیں بڑھتی۔ یہ انجمن ترقی اردو کی خوش قسمتی ہے کہ اسے ایک ایسا آدمی مل گیا جو روپیہ بھی صرف کر سکتا ہے اور محنت بھی جان توڑ کر کر سکتا ہے یہ ہی اور انجمن کی ترقی کا راز ہے۔ اس میں بڑا دخل نیک نیتی، خلوص اور ابتکار کو ہے۔

مولوی غلام ربانی صاحب برسالہ مولوی عبدالحق صاحب کی ۲۵ سالہ سجدی انجمن ترقی اردو کی یادگار کے طور پر خود اپنے شوق سے تحریر کیا اور جن میں مشکلات کا مولوی صاحب اور انجمن کو مقابلہ کرنا پڑا اسے نہایت اچھے پیرایہ میں بیان کیا ہے، کتاب کا آغاز انجمن کے ابتدائی دور سے کیا ہے کہ کیونکر مولانا شبلی، مولانا جمیل الرحمن شہرانی کے ہاتھوں میں سے ہوتی ہوئی انجمن مولوی عبدالحق صاحب تک پہنچی۔ اس وقت انجمن کا کل سرمایہ مصنف کے الفاظ یہ تھا۔

ایک پرانا صندوق جو پوسیدگی کی وجہ سے رسی سے گسا ہوا تھا، ایک رجسٹر اور چند پرانے اور غیر مرتب مسودات۔ ایک قلم و دوات اور بلی انڈ کا نام، اگرچہ آج کل کسی کو ایک لوسے کا گزہ ایک گز کا سا اور ایک کاغذ کے پرزے پر شہرے چھوڑے اور گلیوں کے نام لکھ کر دیدیں اور کہیں کہ جا کر بڑے پٹانے پر تجارت کرو۔ تو سوائے اسکے کہ وہ شخص یا تو مسکرا کر خاموش ہو جاتا یا پھر گالیاں دے اور کہا کر سکتا ہے کہ مولوی صاحب نے ایسا نہیں کیا مگر ہے اس ذمہ داری کو قبول کرنے وقت ان کے ہونٹوں پر ایک جسم گھیا ہو مگر اس کے معنی بھی یہی تھے کہ اچھا۔

گر یہی رنگ تشا ہے تو اب یونہی ہی

اس کے بعد انجمن کا کام شروع ہوا۔ اور رنگ آباد کن۔ ترقی اردو کی سرگرمیوں کا مرکز بنا اور وہ رقبہ جنہیں حقیر خیال کیا جاتا ہے جمع ہوتی شروع ہوئیں جدوجہد ہوئی، دوڑ و دوپ کے ساتھ ساتھ خلوص کام کرنے لگا۔ چندہ اکٹھا کرنا بے انتہا مشکل کام ہے۔ مگر مولوی صاحب نے سب سے پہلے ہی کام کیا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ بغیر روپے کے ہر سکیم چاہے کتنی ہی مفید کیوں نہ ہونا کام ہو کر رہ جاتی ہے۔ مختلف رسائل میں اسکی موافقت میں مضامین لکھنے شروع ہوئے۔ کیونکہ یہ دنیا پر دیکھنے والے کی ہے اور اس کے بغیر کسی کام کو بڑے پیمانے پر چلانا ذرا مشکل ہے۔ اب اس تمام جدوجہد کا نتیجہ یہ ہے کہ انجمن اب وہاں ہے۔ جہاں گمان بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کہ کبھی پہنچ سکے گی۔

ہماری زبان کا سرمایہ ایک محض قصہ کہانیوں تک محدود تھا۔ اسے کسی صورت میں بھی علمی زبان نہیں کہا جاسکتا لیکن اب ہم کر سکتے ہیں کہ یہ ایک علمی اور ادبی زبان ہے۔ آجنگ کوئی کتاب علم سائنس اور فلسفہ جیسے خشک مضامین سے متعلق ہماری زبان میں نہ ملتی اور یوں بھی ہم لوگوں کے راسخ فطرت تا تعیش پسند ہیں۔ ہمارا ہر ادبی آدمی اس دور کے خواب دیکھتا ہے کہ جب اس کا رنگین نکل حقیقت میں بدل جائیگا اور قبول شخصے اسکے لئے۔

دن عید اور رات شب برات ہوگی۔

لیکن انجمن ترقی اردو کی کوششوں سے تصنیف و تالیف اور ترجمہ کی طرف قدم اٹھایا گیا اور آج اس زبان میں بہت سی کتابیں فلسفہ، تاریخ اور سائنس سے متعلق مل سکتی ہیں یہاں تک کہ ابتدائی جماعتوں کی درسی کتابیں بھی جن کا اس وقت تک نقطہ تھا

اس وقت انجمن سے دو ٹھوس رسالے، اردو، اور سائنس نکل رہے ہیں اور انکی اہمیت کی بھی صاحب علم سے پوشیدہ نہیں۔

غرضیکہ تمام کتاب انجمن اور مولوی صاحب کی کاوشوں اور مشکلوں کے ساتھ ساتھ اسکی ترقیوں کی بھی ایک مختصر روداد ہے، اخیر میں انجمن چند مفید کتابیں مثلاً میکسم گورکی کی خود نوشت سوانح عمری قاضی نذرا سلام کی بنگالی نظموں کا ترجمہ پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران اور نشتے کی تصنیف قبل ازشت کا ترجمہ وغیرہ وغیرہ اشیا جون، جولائی ۱۹۲۷ء

کی ہرست درج ہے۔ انجن اور اردو زبان سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے ایک اچھی چیز ہے۔ چاہئے کہ لوگ اسے زیادہ سے زیادہ تعداد میں خرید لیں۔

انشائے داغ۔ انجن ترقی اردو (دہند) دہلی۔ قیمت ایک پیسہ چھ آنے

یہ مرزا داغ دہلوی کے خطوط کا مجموعہ ہے جس میں پہلی فصل میں دالیان ریاست، حکام، عمال اور اہلکار کے نام خطوط ہیں۔ دوسری فصل میں مخصوص اعزہ و اجاب اور تلامذہ کے نام خطوط ہیں۔ تیسری فصل میں بسلسلہ شاعری شاگردوں کے نام خطوط ہیں۔ مقدمہ سے پہلے احسن نظم کی بہت عمدہ تصویر ہے اور مقدمہ کے بعد مرزا داغ کی تصویر ہے داغ صاحب اس تصویر میں شاعر اور غوجی زبان معلوم ہوتے ہیں بہر حال خیالات و احساسات کی تنظیم میں عسکری تنظیم سے کچھ کم نہیں۔

ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ لوگوں کو ہندوستان میں اپنے مشاہیر کے خطوط سے دلچسپی ہو گئی ہے۔ دراصل خطوط ہی ایسی چیز ہیں جن کی شخص کی انفرادیت اور اخلاق زندگی کی عکس کشی ہوتی ہے کسی بھی زبان میں کیوں نہ ہوں خطوط کی اہمیت کبھی کم نہیں ہوتی۔

اکثر ایسا ہوا ہے کہ ادبی شخصیتیں دماغی غلیان اور خلفشار میں مبتلا رہی ہیں۔ ایسا بہت کم ہوا ہے کہ وہ دنیا و باغیاہ سے بے خبر اپنے ادبی کاموں میں مصروف رہتے ہوں۔ اور اس ذہنی کشمکش نے انہیں باریا محبوب کیا کر اپنی ان تخیلیوں اور مجبوروں کی داستان کسی کو سنائیں تاکہ کچھ بوجھ ملکا ہو جائے۔

ہر شخص کی زندگی کے عموماً دو رخ ہوا کرتے ہیں ایک وہ جو عوام کے سامنے پیش ہوتا ہے اور دوسرا وہ جو کبھی عوام کے سامنے نہیں آتا اس دنیا میں ہر شخص اپنے منہ پر ایک نقاب ڈالے چیز نا ہے۔ ہمارے گرد و پیش جس قدر بھی چیز ہے میں ان میں بہت کم اپنے اصلی روپ میں ہوتے ہیں بلکہ اپنے اصلی روپ میں کبھی ہوتے ہی نہیں۔ ہماری اس دنیا کا رویہ کالو قسم کا رہا ہے اور ہر ایک کاروبار کے لئے کچھ خاص قسم کی عادتوں و رواجوں کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ ہم میں سے جو لوگ وہ مہارتیں حاصل کر لیتے ہیں وہ لوگ کامیاب زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور جو وہ عادتیں اور مہارتیں جن کی قدم قدم پر ضرورت ہے حاصل نہیں کر سکتے وہ اس زندگی کی دوسری

کھیلے جاتے ہیں۔ اگرچہ ایک عرصہ سے جب سے انسان کی شعور بستی بکھلی جا کر ہوئی ہیں اخلاقیات کے اصول مرتب ہو چکے ہیں۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ آجنگ اصولوں ہی کی حد تک ہیں اس سے زیادہ ان کی کوئی وقعت نہیں۔

کسی انسان کو جینک وہ اپنے منہ پر سے نقاب اتار رہا ہے بہت مشکل کام ہے اور بہت مشکل ہے کہ آدمی منظر عام پر آکر اپنے چہرے سے وہ نقاب الٹ لے جس نے اسے عزت یا ذلت جو کچھ دی ہو، لیکن ایسا ہوتا ضرور ہے کہ آدمی اپنے چہرے سے نقاب الٹتا ہے اور وہ صرف تنہائی ہے جس میں آدمی بالکل بے نقاب ہوتا ہے یہ بھی ضروری ہے کہ ہر آدمی کا کوئی کرم راز ہو۔ آدمی ہر کرم راز کے سامنے اپنا منہ کھول کر رکھ دیتا ہے۔ اپنے چہرے کو نقاب الٹ کر پھینک دیتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات تو بالکل عریانہ ہو جاتا اس عریانیت کا پتہ لگانے کا بھی کوئی طریقہ اس وقت معلوم نہ تھا۔ مگر اس معلوم ہو گیا ہے۔ اور وہ کسی انسان کے خطوط ہیں اس سے کسی کرم راز کو لکھے ہوں۔

خطوط انسان کی زندگی کے آئینہ دار ہیں۔ غالباً اگر یہ خطو خطو جو اس نے مختلف عورتوں سے عشق کے دوران میں لکھے ہیں تو کوئی بھی اسکی اخلاقی زندگی کا پتہ نہ لگا سکتا۔ اس طرح اگر کوئی نوجوان اپنے روزانہ کے اوصاف کی حقیقت اپنے کسی محبوب کو لکھ کر بھیجتا شروع کر دے تو ظاہر ہے کہ وہ اس کی زندگی کے آئینہ دار ہوں۔ کوئی بھی اس خیال سے خطوط نہیں لکھتا کہ یہ کبھی منظر عام پر آئیں۔ اس کی یاد وہ جو چاہتا ہے نہیں بلکہ جو اسکی زندگی ہوتی ہے وہ خطوط بنایاں کر دیتا ہے۔ جس طرح ایک مصور تصویر کھینچتے وقت اپنے سامنے رکھی ہوئی چیز کے غیر نمایاں حصہ تک نہیں چھوڑتا۔ اس لئے لکھنے والا اپنی زندگی کے غیر نمایاں پہلو خط میں لکھے بغیر باقی نہیں رہ سکتا۔ ہر کتب خانہ میں اس کے سوا کوئی جائزہ نہیں دے سکتا کہ خطوط میں اور ایسی چیزیں اگر پاس رہیں تو کوئی برائی نہیں۔ تاکہ اپنے مشاہیر کی اخلاقی زندگی کا بھی علم ہو جائے۔

(ادارہ)

ثروت آرا بیگم

محترمہ حمیدہ سلطان کا شاہکار

حمیدہ سلطان صاحبہ جو ہندوستان کی ادیب خواتین میں ممتاز درجہ رکھتی ہیں۔ ادبی حلقوں کے بہم اصرار اور تقاضوں سے شاہراہی قدیم تصنیف ”ثروت آرا بیگم“ شائع فرمادی ہے۔ یہ اخلاقی و ادبی لحاظ سے ایک خاص مرتبہ کا ناول ہے جس میں نئی اور سماج کی کامل و صحیح تصویر کھینچی گئی ہے۔ ”ثروت آرا بیگم“ میں قیاس سے بعید تصویریت اور گزری ہوئی شعریت کی جھلک نہیں ہے۔ میں مقررہ ماحول اور کردار کی مطابقت و افیت نگاری کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ اور وہ واقعت نگاری ایک خاص ماحول سے تعلق رکھتی ہے۔

”ثروت آرا“ کی زبان اُسے نمایاں طور پر دوسرے ناولوں سے اک امتیاز بخشتی ہے۔ اس کا ہر صفحہ منہ سے بول رہا ہے کہ یہ ایک عورت کی تصنیف ہے۔ زبان کی بے ساختگی اور لطافت نے اس ناول کو بڑی امتیازی حیثیت دیدی ہے۔ یہ بڑی تسکین دہ بات ہے۔

مذاہب بیان اور اسلوب میں روایتی رومان نگاری اور افسانویت نہیں پائی جاتی۔ بظنی ترکیبیں اور لہجے کی بے ساختگی، وقار اور کمالہ بان کا معیاری لوچ یہ تمام عناصر ایسے گھلے ہوئے ہیں کہ کتاب شروع کرنے کے بعد کوئی اسے ادھر ادھر نہیں چھوڑ سکتا۔ یہی نہیں

ثروت آرا بیگم“ اپنے انداز کا خاص کچھ، تہذیب اور تمدن رکھتی ہے۔ اُس کو پڑھ کر دلی کی مٹی ہوئی تہذیب کا نقشہ آنکھوں میں کھنچ جاتا اس کے مطالعہ سے دسیوں محاورے جو دلی کے مردوں میں نہیں عورتوں میں بولے جاتے یہی معلوم ہو جاتے ہیں۔

حمیدہ سلطان صاحبہ نے اس ناول کو اپنے بڑا و محترم آنریبل مسٹر فخر الدین علی احمد سابق رپو نیمنسٹر (آسام) کے نام مبعون کیا ہے۔

بیں فخر الدین صاحب کی تصویر بھی شریک کتاب ہے۔ مینیجر

ملنے کا پتہ :- مکتبہ ساغر ادبی مرکز میٹھ

”رسالہ ادیب“ دہلی

